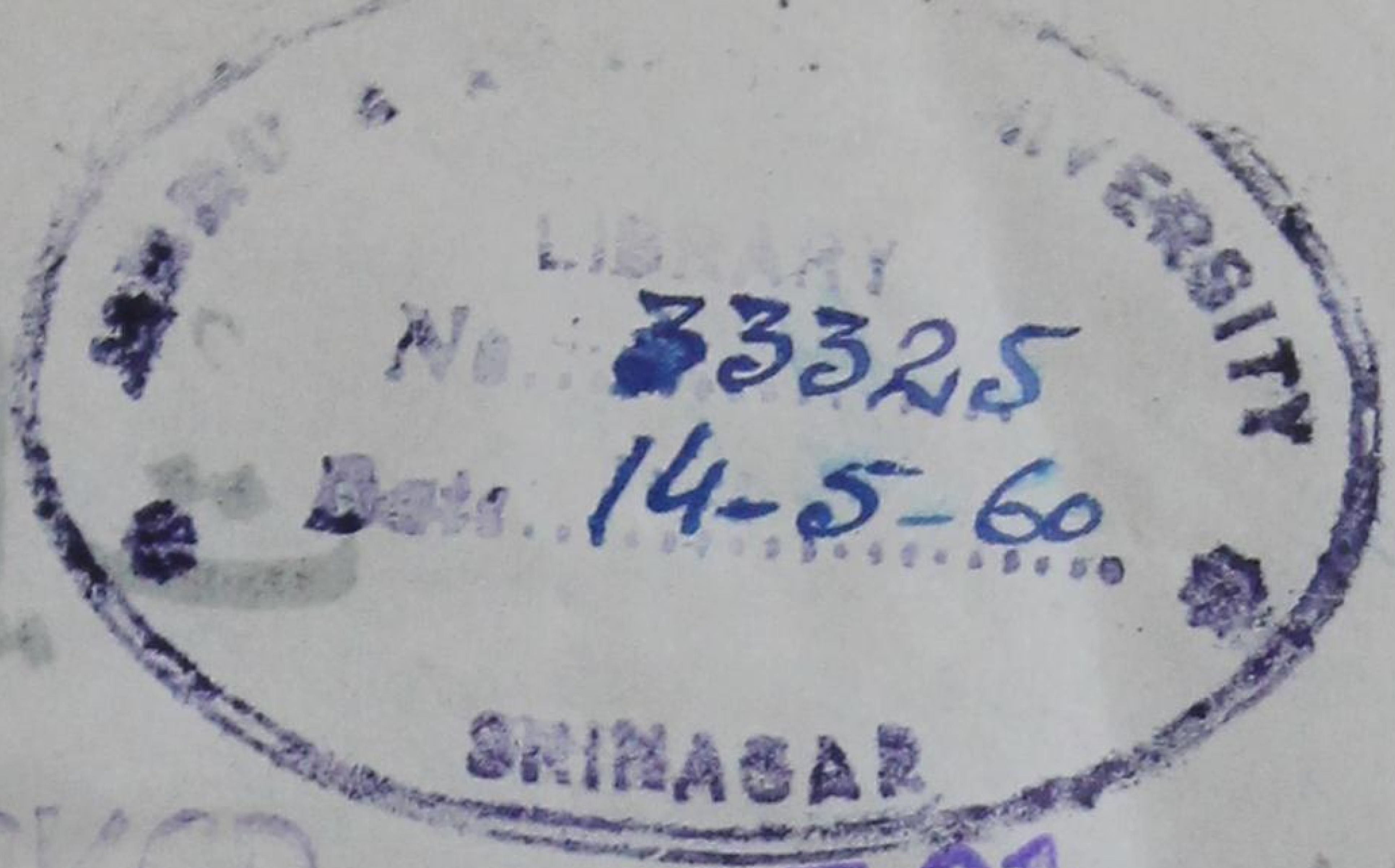
لاہوریات

شوکت تھانوی

"مضامین کا مجموعہ"

لاہوریات



قیمت ــــ ــــ ــــ ــــ تین روپے

ناشر

بھوشن ــــ بکڈپو ــــ دھلی



مطبوعہ

جیّد برقی پریس دھلی

لاہوریات

شوکت تھانوی

فہرست

اگر میں بیوی ہوتا

بیوی ہونا دراصل بجائے خود ایک آرٹ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس مستقل فن کو ایک لطیفہ یا زیادہ سے زیادہ ایک حادثہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ ورنہ ضرورت تو یہ تھی کہ اس فن کو بحیثیت فن کے طرح طرح کے کمالات کے ساتھ حاصل کیا جاتا اور اس آرٹ کو تماشہ بنانے کے بجائے سنجیدگی کا مستحق سمجھا جاتا۔ مگر مصیبت تو یہ ہے۔ کہ اتنا اہم فن جا پڑا ہے بے چاری عورتوں کے ہاتھ میں۔ وہ کیا جانیں کہ بیوی بننا کس قدر نازک اور اہم ذمہ داری ہے اور اس کے لئے کس قدر فن کارانہ صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ پھر غضب یہ ہے کہ مقابلہ آ پڑا ہے مرد

ایسی چلتی ہوئی جنس سے جس کو خواہ شوہر بننا نہ آتا ہو، مگر بیوی کو بیوی ہونے کے مغالطہ میں مبتلا کرنا خوب آتا ہے۔ وہ اپنی قابلیت سے بیوی کو کبھی یہ محسوس تک نہیں ہونے دیتا کہ تمہارا فن ناقص ہے اور بحیثیت آرٹسٹ کے تم محض اناڑی ہو۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ مرد یعنی شوہر کی عافیت اسی میں ہے۔ بیوی بیوی ہونے کے فن سے دُور ہی دور رہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ عورت بیچاری یہ سمجھ ہی نہیں سکتی کہ بیوی بننے کے لئے اور مرد سے مقابلہ کرنے کے لئے اس کو کس بلا کا نظرباز، کس قیامت کا نباض اور کس آفت کا ماہر نفسیات ہونا چاہیئے وہ زیادہ سے زیادہ شوہر کو دھمکا لینا۔ اُس کی انتہائی زیادتیوں پر ذرا سا ڈانٹ دینا۔ کبھی کبھی رو دینا۔ اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ رہنا، منہ پھلا کر بیٹھ رہنا۔ بھوک ہڑتال کر دینا۔ یا بہت ہوا تو ڈولی منگا کر میکے چلے جانے کی دھمکی دے دینا جانتی ہے۔ مگر مرد نے ان تمام حملوں سے بچاؤ کی ترکیبیں بحیثیت فن کے حاصل کی ہیں۔ وہ اپنے الفاظ سے اپنی ایکٹنگ سے اپنی جادو بیانی سے برمحل غصہ سے کبھی مسکراہٹوں سے کبھی دھونس جما کر، کبھی دھونس کھا کر کبھی مرعوب کر کے اور کبھی مرعوب ہونے کی اداکاری کے ساتھ وہ چال چلتا ہے۔ کہ بیگم صاحبہ کا تمام اصلاحی یا انتقامی جذبہ ایک دم ختم ہو کر رہ جاتا ہے اور وہ اُلٹی شرمندہ سی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ کہ ایسے فرشتہ خصلت شوہر کے متعلق ان کو بدگمانی ہی کیوں پیدا ہوئی۔ حالانکہ اگر وہ ذرا قیافہ شناس تھوڑی بہت ماہر نفسیات اور مناسب حد تک نباض ہوتیں تو ان کو اسی اداکار شوہر، اسی مشاق آرٹسٹ اور اسی مداری کے سارے کرتب سمجھ میں آ جاتے۔

کسی اور پر حملہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ اخلاقی جرات سے کام لے کر ہم خود کیوں نہ اپنی شوہرانہ فن کاری اور اپنے مدِ مقابل کی بیویانہ سادہ لوحی پر ایک روشنی ڈال دیں۔ ہمارا تو زندگی بھر کا تجربہ بھی ہے۔ کہ اگر ایک شوہر اپنی بیوی کو ایک مرتبہ ذرا دل لگا کر پڑھ لے تو اس کو زندگی بھر کا سکھ حاصل ہو سکتا ہے۔ اور وہ ہر جوابی حملہ بیوی کی کمزوریوں کو بھانپ کر کرتا ہے۔ مثلاً ہم نے عجیب عجیب ترکیبوں سے یہ اثر قائم کر رکھا ہے۔ کہ ہم میں دنیا کے تمام عیب تو ممکن ہیں مگر جھوٹ نہیں بول سکتے۔ اس اثر کے قائم کرنے میں ظاہر ہے کہ بڑی بڑی مصیبتیں جھیلی ہوں گی۔ طرح طرح کی آزمائشوں سے واسطہ پڑا ہو گا۔ مگر یاد رکھیے کہ اسی قسم کے امتحان ایک شخص کو اعلیٰ مدارج پر پہنچایا کرتے ہیں۔ تو مطلب یہ کہ اپنی سچائی کا سکہ جمانے کے لیے ہم کو شروع شروع میں نہایت ڈھنگ قسم کے جھوٹ تراشنا پڑے جو بظاہر نہایت خوفناک سچ ثابت ہوئے۔ مثلاً ایک دن کہہ دیا ان سے "بھئی سنتی ہیں آپ۔ اب آپ چاہیں معاف کریں یا نہ کریں، مگر میرا دل یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میں آپ سے اپنے کو پردے میں رکھوں میری اچھائیاں آپ پر روشن ہیں تو برائیاں بھی ضرور معلوم ہونا چاہئیں۔ آپ میری شریک زندگی ہیں تو زندگی کے ہر رخ کو دیکھنے کا حق رکھتی ہیں۔ مجھے سخت افسوس ہے۔ اور میں نادم ہوں مگر میں یہ کہہ کر اپنا بار ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ کہ میں تھوڑا بہت جوا کھیل لیا کرتا ہوں۔ اور ہاں اس سلسلہ میں اکثر چوری بھی کی ہے۔ چنانچہ کل میں نے شادی کی انگوٹھی بھی اسی سلسلہ میں چرا کر بیچ ڈالی۔ اب آپ کو اختیار ہے جو چاہے کیجیے۔ مگر میں نے سچ بول

دیا ہے۔"

جانتے ہیں آپ اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ وہ روئیں؟ گرجیں؟ برسیں؟ جی نہیں، پھول کی طرح شگفتہ ہوگئیں۔ آنکھوں میں مسرت کے آنسو آ گئے۔ مارے خوشی کے ہکلانے لگیں۔ اور بڑی محبت سے فرمایا "جوا کھیل لینا دوسری بات ہے مگر مجھ کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ آپ جواری کبھی نہیں ہو سکتے۔ جو ایسا سچا ہو وہ اتنا بڑا کبھی نہیں ہو سکتا۔" صرف یہی نہیں کہا۔ بلکہ تیسرے ہی دن ویسی ہی انگوٹھی پھر ہماری انگلی میں پہنا دی گئی۔ اس قسم کی جھوٹی سچائیوں نے وہ بھرم قائم کیا ہے کہ ہم کیا عرض کریں۔ حالانکہ پہلے جھوٹ موٹ سچ بولے تھے۔ مگر اب سچ مچ جھوٹ بول کر اپنی ہر مشکل آسان کر لیتے ہیں۔ رات کو تین بجے خدا جانے کن دلچسپیوں سے اٹھ کر گھر پہنچے آپ احتجاج کے طور پر صحن میں ٹہل رہی ہیں۔ دیکھتے ہی نہایت طنز سے فرمایا "مل گیا آپ کو اپنا گھر اس اندھیرے میں" ہم نے نہایت اطمینان سے عرض کیا "اندھیرا نہیں اب تو روشنی ہی روشنی ہے۔ مولانا صاحب قبلہ کے واعظ ہونے کو تو تمام دنیا جانتی ہے مگر میں تو ان کو جادوگر سمجھنے لگا ہوں۔ قلب روشن کر دیا۔ کیا کہنا ہے، وہ میٹھی زبان اور دل نشیں انداز بیان کہ سبحان اللہ۔ مجھے نماز کے وقت اٹھا دیجئے گا" لیجئے تمام قصہ ختم تو وہ طنز رہا نہ غصے کی وہ مشق کام آئی جو رات بھر ٹہل ٹہل کر فرمائی گئی ہوگی۔ بلکہ بیٹھی نہایت عقیدت سے وعظ کی تفصیلات سن رہی ہیں۔ اور شوہر کی نیک نفسی پر دل ہی دل میں جھوم رہی ہیں۔ حالانکہ اگر ہم بیوی ہوتے تو اسی وقت سے فائدہ اٹھا کر تمام بھانڈا پھوڑ دیتے۔ ذرا زبان کی لکنت پر غور کرتے۔ ذرا اکھڑے اکھڑے انداز بیان سے تاڑتے۔ ذرا سینہ پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکن کو پرکھتے۔

ذرا پاتوں کے جمے ہوئے لاکھے کو دیکھتے اور یہ نتیجہ نکال لیتے کہ محفلِ وعظ میں اس کثرت سے پان نہیں کھائے جاتے۔ پھر ان باریکیوں پر جاتے کہ سچ بولتے ہوئے انسان اس قدر خوش اخلاق نہیں ہوتا۔ جس قدر جھوٹ بولتے وقت ہوتا ہے مختصر یہ کہ اس آسانی سے جھوٹ کو سچ نہ سمجھ لیتے۔ جس آسانی سے سمجھا دیتے ہیں۔ بلکہ اگر سچ پوچھئے تو اس بات پر اکثر غصہ بھی آتا ہے کہتے ہوئے ہم خود بیوی در تہ ؎

خدا گواہ جو ہم آپ کی جگہ ہوتے
تو بے وقوف نہ بنتے بنا دیا کرتے

مجرم کا دل ہی کتنا ہوتا ہے۔ نہ اس کا غصہ وزنی، نہ رعب پائیدار، نہ اس کی خوشامد معتبر نہ اخلاق کا اعتبار جہاں پتہ کی دو باتیں کہیں وہ حضرت تو خود گڑبڑا کر رہ گئے۔ اس گھریلو قسم کی ڈانٹ ڈپٹ اور اس نجی قسم کی نکتہ چینیوں سے ہم کبھی شوہر کو راہِ راست پر لانے کے بجائے ہاتھ سے نہ کھوتے۔ بلکہ ان چالاکیوں سے مقابلہ کرتے یہ نہیں کہ ہم نے ذرا نخرے سے کہہ دیا۔ کہ دیکھو جی ہم کو ان باتوں پر غصہ آتا ہے۔ اس چالاک نے فوراً حاضر جوابی سے کہہ دیا۔ کہ غصہ تو مجھے اچھا لگتا ہے۔ سنا نہیں ہے تم نے وہ شعر کہ ؎

اُن کو آتا ہے پیار پر غصہ
مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے

اور ہم مارے بے وقوفی کے اس چالاکی پر خوش ہو کر رہ گئے۔ جی نہیں۔ ضرورت ہوتی سُراغ رسانی کی۔ ان حضرت کو پڑا جاتا۔ اُسی گوشۂ عافیت میں جس کا نام کبھی یہ مشاعرہ رکھتے ہیں۔ کبھی محفلِ وعظ، کبھی کسی دوست کی شادی کبھی دفتر

کی ارجنٹ شب بیدار ٹینگ وغیرہ۔ مگر یہ تو اُسی وقت ہوسکتا تھا۔ کہ ہم بیوی ہوسکتے۔ اور شوہرانہ تجربہ کے بعد ہوسکتے۔ مگر ایسا نہ ہوا ہے نہ ہوسکتا ہے۔ لہذا یہ ذکر ہی فضول ہے۔ اور ایسی بُری فال دراصل زبان سے نکالنا ہی نہ چاہیئے۔ فرض کرلیجئے کہ واقعی زن و شوہر کی سالانہ جنسی تبدیلی ہونے لگے۔ تو کیا ہوگا۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ زندگی ہی عذاب بن کر رہ جائے گی۔

لاہوریات

اگر آپ لاہوری نہیں ہیں اور اگر آپ کو پنجابی ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے
تو آپ یقیناً اس خاکسار کے تجربات سے زیادہ فائدہ اٹھا کر ان تمام
خطرات سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ جو ایک اجنبی کو لاہور پہونچ کر پیش آ سکتے ہیں۔
یہ خطرے یا تو زادِ راہ کے طور پر لوگ ساتھ لے جاتے ہیں۔ ورنہ لاہور ہی میں
نہایت آسانی کے ساتھ دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اس خاکسار نے محض ملک و
قوم کی خدمت کے لئے ایک سال تک لاہور میں رہ کر ان خطروں کا تجربہ کیا
ہے۔ اور اب خلق اللہ کے فائدے کے لئے اپنے تمام تجربات پیش کرنا چاہتا
ہوں۔ کہ شاید میرا یہی ایک نیک کام میری بخشش کا ذریعہ بن سکے۔ اپنے تجربات
کی تفصیل پیش کرنے کا میں یہ طریقہ اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ کہ عازمینِ لاہور کی

خدمت میں کچھ ہدائتیں پیش کردوں۔

وہ حضرات جو ہندوستان کے قابلِ دید مقامات کی سیاحت کے سلسلہ میں لاہور جانا چاہیں ان کو لاہور جانے سے روکنے کا اس خاکسار کو کوئی حق نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ خود لاہور پہنچ کر لاہور والوں کے لئے قابلِ دید مقام ثابت نہ ہوں۔ ان کو چاہیئے کہ وہ نہایت خاموشی کے ساتھ لاہور پہنچ کر ٹھنڈے دل سے لاہور پر غور کریں۔ انسانیت کے ساتھ لاہور کی سیر کریں اور شرافت کے ساتھ واپس آجائیں۔ اگر آپ پیغمبری کا دعوےٰ لے کر یا اسی قسم کے کسی اور دھوم دھڑکے کے ساتھ لاہور تشریف لے گئے تو پھر آپ جانیں اور لاہور والے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ سب آپ کی امت میں آجائیں۔ اور اس کا بھی خطرہ ہے۔ کہ وہ لاحول پڑھیں اور بھاگنا پڑے آپ کو۔ خیر یہ تو میں نے بہت گہری باتیں شروع کر دیں۔ پہلے تو مجھے کچھ سطحی مشورے دینا تھے۔ مثلاً آپ کو چاہیئے۔ کہ اپنے بستر میں موسم کے لحاظ سے کچھ زیادہ سامان رکھیں۔ یعنی اگر یہ سفر آپ نے موسم سرما میں کیا ہے تو ایک کے بجائے دو لحاف لے کر چلیئے۔ اور دل میں یہ اعتقاد رکھیئے کہ لاہور میں آپ کے وطن سے دوگنی سردی پڑتی ہے۔ اسی مناسبت سے لباس بھی لے کر جائیے۔ تاکہ آپ کے ساتھ لاہور کا موسم تعصب نہ برتے اور آپ کو لاہور کے موسم سے صوبجاتی جنگ کی شکایت پیدا نہ ہو۔ اسی طرح اگر آپ نے یہ سفر موسمِ گرما میں کیا ہے تو بھی آپ کے ساتھ ایک کے بجائے دو پنکھے ہونا چاہئیں لاہور کی گرمی کے لئے ایک پنکھا ہرگز کافی نہ ہوگا۔ رہ گئی برسات اس قسم کا کوئی موسم لاہور میں نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی بارش ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے

لئے لاہور والے یہ کہتے ہیں کہ یہ تو خدا کی دین ہے۔ اس کے لئے کسی موسم کی قید کیوں
ہو۔ اس کی رحمت جاڑے میں بھی نازل ہو سکتی ہے۔ اور گرمی میں بھی۔ لہذا
برساتی یا اسی قسم کے کسی برساتی سامان کا آپ کے ساتھ ہونا چنداں ضروری نہیں ہے
اول تو بارش کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ اور اگر اتفاق سے بارش ہو بھی گئی تو لاہور
کی ہر اسٹیشنری کی دوکان پر بلاٹنگ پیپر مناسب قیمت پر آپ کو مل سکے گا۔
جس میں بارش کے قطرے جذب کرنے کی پوری صلاحیت ہوتی ہے۔ موسم خواہ
کوئی بھی ہو مگر آپ کے بستر میں پلنگ کی چادر اتنی بڑی ضرور ہونا چاہیئے۔ جو
زمین تک ہر طرف سے پہنچ سکے۔ اس احتیاط کی قدر آپ اس وقت کریں گے۔
جب لاہور کے کسی ہوٹل میں آپ کا قیام ہوگا۔ اوپر سے مچھر آپ کو پریشان کریں
گے۔ اور نیچے سے کھٹمل مزاج پوچھیں گے۔ ان دونوں سے نجات کی صرف یہی
صورت ہے۔ کہ ہوٹل کی چارپائی پر سونے کے بجائے آپ چارپائی کے نیچے
سوئیں۔ تاکہ لٹکی ہوئی چادر مچھردانی کا کام دے اور چارپائی کے کھٹمل بستر
پر آپ کو نہ پاکر یہی سمجھتے رہ جائیں کہ مسافر کہیں گھومنے گیا ہے

کھانے پینے کی تمام چیزیں آپ کو آسانی کے ساتھ مل سکیں گی۔ بشرطیکہ
ان کی ترکیب استعمال کی تربیت آپ پہلے ہی حاصل کر چکے ہوں کسی چیز کے
ساتھ پرچہ ترکیب استعمال آپ کو نہ ملے گا۔ بلکہ آپ سے عام توقع یہی ہوگی
کہ آپ روٹی کے ساتھ چاول اور دال کے ساتھ سالن نہ کھائیں گے۔ اگر آپ نے
محض اس شوق میں کہ لاہوری کھانے کھائیں نئے نئے تجربے حاصل کرنا چاہے۔
تو اس کا بھی اندیشہ ہے کہ آپ "جھٹکے" کو کوئی نئی چیز سمجھ کر کسی دوکان میں گھس

جائیں اور وہاں آپ کے اعتقاد کو جھٹکا کھانا پڑے۔ عافیت اسی میں ہے۔ کہ
آپ لاہور کے متعلق یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ یہ کسی نئی دنیا کا کوئی شہر ہے جہاں کے کھانے
بھی الگ ہوتے ہوں گے۔ البتہ میرا یہ مشورہ ہے کہ بازار میں اگر آپ کو تلی ہوئی مچھلی
کی کوئی دوکان نظر آجائے تو ضروری سے ضروری کام چھوڑ کر یہ مچھلی ضرور کھا لیجئے گا۔
ممکن ہے کہ آپ اسی کو حاصل لاہور سمجھ سکیں۔ ملائی کی برف بھی دوسرے شہروں کی
طرح بناسپتی نہیں ہوتی۔ بلکہ خالص آپ کو انارکلی میں مل سکے گی۔ اور اگر خدا آپ کو
توفیق دے تو پھلوں کا عرق ضرور پی لیجئے گا۔ رہ گئی لسی وہ تو اب آپ کے لئے کوئی نئی
چیز نہ ہوگی۔ البتہ اس کا صحیح ذائقہ چکھ کر آپ کو یہ ضرور معلوم ہوگا۔ کہ اب تک
آپ جو لسی پی رہے تھے۔ وہ دراصل لسی نہیں بلکہ لسی کی "اداکاری" تھی۔ ہاں اگر
آپ خدانخواستہ پان کے عادی ہوں تو اپنا پاندان بردار ساتھ لیتے جایئے گا۔ ورنہ
اس عادت کو وطن ہی میں چھوڑ کر لاہور کا ارادہ کیجئے گا۔ پان وہاں ہوتے ضرور
ہیں۔ مگر اسی طرح جیسے اپنے وطن میں آپ ایک چیز یہ سمجھ کر پیتے ہیں کہ یہ گویا لسی
ہے۔ یوں دیکھنے کو تو لاہور میں بھی بے شمار پانوں کی دوکانیں ہیں۔ جہاں یہ بھی آپ
سے پوچھا جائے گا۔ کہ میٹھا پان دیا جائے یا سادہ اور آپ حیران رہ جائیں گے۔ کہ یہ
میٹھا پان کیا بلا ہے۔ بہر صورت وہ میٹھا پان ہو یا سادہ مگر آپ اس کو بمشکل تمام
پان سمجھ سکیں گے۔ یہ خاکسار پان کی عادت لے کر لاہور گیا تھا۔ اور مجبوراً وہاں بٹوہ
رکھنا پڑا تھا تاکہ طلب کی تسکین بھی ہوتی رہے اور پان بھی کھانا نہ پڑے۔ لاہور میں
کہیں کہیں آپ کو کولہو نما ایک چیز نظر آئے گی۔ اس چیز کو اگر اہل لاہور حقہ کہیں تو آپ
شک کی نظر سے ان کو نہ دیکھئے گا۔ وہ واقعی حقہ ہوتا ہے۔ اور اہل لاہور اس قسم

کی باتوں میں جھوٹ کبھی نہیں بولتے۔

قابلِ دید مقامات میں اب کچھ ردوبدل ہو گیا ہے۔ مثلاً شالامار باغ پنشن لینے کے بعد سے کچھ گوشہ نشین سا ہو گیا ہے۔ وہاں اب باغ بہت ہی کم پایا جاتا ہے البتہ شالامار کی کوئی انتہا نہیں۔ جہانگیر کا مقبرہ حدودِ میونسپلٹی سے روز بروز باہر ہوتا جا رہا ہے۔ شاہی مسجد نمازیوں کی کمی کی وجہ سے اور بھی عظیم الشان نظر آنے لگی ہے لیکن اب ان قابلِ دید مقامات میں چند کا اضافہ بھی ہو گیا ہے۔ مثلاً درگا موٹا، انسانی شکل کی چلتی پھرتی نہایت عظیم الشان عمارت ہے۔ جس میں آج کل پنچولی آرٹ پکچرس نے اپنے کئی اسٹڈیو کھول رکھے ہیں۔ ایک آدھ عمارت اور بھی ہے۔ جو فلم کمپنیوں میں پس پردہ موسیقی کا کام دیتی ہے۔

خاص خاص بارونق بازاروں میں انارکلی کا ذکر سب سے پہلے کرنا پڑیگا۔ تاکہ وہاں آپ شاہزادہ سلیم بننے کی کوشش ہرگز نہ کریں انارکلی بے شمار کلیاں آپ کو انارکلی میں اِدھر اُدھر لہراتی ہوئی نظر آئیں گی۔ لیکن اس طوفان رنگ و بو میں اگر آپ نے ذرا بھی احتیاط کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑا تو ممکن ہے۔ کہ تاریخ وفات اسی مصرعہ سے نکل آئے کہ۔ ؏

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور

ان سب کو خاموشی سے دیکھنا اور خوش ہونا چاہیئے۔ البتہ اگر بہت ہی شعریت ستائے تو اس قسم کے مصرعے آپ زیر لب گنگنا سکتے ہیں۔ کہ۔ ؏

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو، دنیا کی زینت تم سے ہے

اس بارونق بازار کی رونق کا یہ عالم ہے کہ جابجا تعمیر کے سلسلے۔ سڑک کی کھدائی

(۱) مختصر یہ کہ کچھ نہ کچھ توڑ پھوڑ آپ کو ضرور نظر آئے گی اس بازار کی قسمت میں یہی ہے کہ کچھ بنتا رہے اور کچھ بگڑتا رہے۔ جب کچھ بن جاتا ہے تو اس کو کچھ اور بنانے کے لئے کھود ڈالتے ہیں تاکہ یہ ثابت ہوتا رہے۔ کہ انار کلی کی تعمیر ابھی تک تکمیل کو نہیں پہنچی ہے۔ کہتے ہیں کہ انار کلی کا دھڑکتا ہوا دل اس بازار کی بنیادوں میں موجود ہے۔ اور یہ مشکل ہے کہ بازار کو کبھی سکون حاصل ہو۔ ایک مرتبہ انار کلی کی سیر کرنے کے بعد ایک ہفتہ تک دانت کرکرایا کرتے ہیں۔ اور معدہ میں اس قدر دھول جمع ہو جاتی ہے۔ کہ اس پر ملتان کا شبہ ہونے لگے۔ یہ بازار اردو بک اسٹال سے شروع ہو کر مال تک چلا گیا ہے۔ راستہ میں ایک دنیا آباد ہے۔ چاٹ کی دکانیں۔ کرنال شاپ کی جلیبیں۔ ملائی کی برف۔ بھلّہ فوٹ ویر۔ یہ اب دیکھنے والے کا کام ہے۔ کہ ان میں سے کھانے کی چیزوں اور دوسری چیزوں میں امتیاز کرے۔

لاہور کی مال روڈ البتہ عجیب وغریب بازار ہے۔ صاف ستھری، اور شاندار دکانوں کا ایک طویل دورویہ سلسلہ اور لطف یہ کہ بازار پر بازار کا شبہ بھی نہیں ہوتا۔ کالجوں کے طالب علم پارلیمنٹ کے ممبر بنے ہوئے اپنی نمائش کرتے پھرتے ہیں۔ کچھ پیدل کچھ موٹروں پر اور کچھ بچہ گاڑیوں میں اپنی آیاؤں کے ساتھ۔ باہر سے جانے والا اگر یہ سمجھ کر دل خوش کرنا چاہے کہ وہ کسی مغربی شہر کی سیر کر رہا ہے۔ تو مال روڈ اس کے اس گمان کو غالب بنانے میں ہر طرح مدد دینے کو تیار نظر آئے گی۔ اس بازار سے بازار سے زیادہ لوگ باغ کا کام بھی لیتے ہیں۔ خرید و فروخت کے لئے جو لوگ آتے ہیں۔ وہ یہاں صاف پہچان لئے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ چہروں پر جو عالم بیفکری کی علامت محض گھومنے والوں میں نظر آتی ہے۔ وہ

ان کے بشرے سے نہیں ٹپکتی۔ گھومنے والوں کی نظریں دوسرے گھومنے والوں اور گھومنے والیوں پر ہوتی ہیں۔ اور ان کاروباری لوگوں کی نگاہیں سائن بورڈوں پر۔ اس بازار سے اپنے حسن اپنے لباس اپنی جوانی اپنی تندرستی وغیرہ کی نمائش کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ اور اس طرح یہ بازار ایک قسم کا بازارِ مصر بن کررہ گیا ہے۔ جہاں سینکڑوں یوسف خود بینی و خود نمائی کے آئینے لئے پھرتے ہیں۔

لارنس گارڈن عشاق اور شعراء کے لئے بہترین گوشۂ تنہائی ہے حالانکہ یہاں اس کثرت سے تنہائی پسند جمع ہو جاتے ہیں کہ کوئی بھی تنہا رہنے نہیں پاتا پھر بھی اس گلشن کی رونق کسی ہنگامہ پر موقوف نہیں ہوتی (خصوصاً وہ سڑکیں جہاں دانستہ روشنی کا انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ خواب کی گلیاں نظر آتی ہیں۔ جہاں بے شمار پرچھائیاں ادھر ادھر متحرک نظر آتی ہیں۔ ہر پرچھائیں ایک دوسرے کو دیکھ کر کتراتی ہے اور اسی آنکھ مچولی میں یہاں کی غروب آفتاب کے بعد والی تفریح ختم ہو جاتی ہے۔

لاہور جاکر بہت سے سیاحوں کو اخبار پڑھنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ شوق بُرا نہیں ہے۔ بشرطیکہ اس کے مضر نتائج سے آدمی شروع ہی سے آگاہ رہے اس لئے کہ یہی شوق رفتہ رفتہ اچھے خاصے آدمی کو ایڈیٹر تک بنا دیا کرتا ہے۔ ہم نے اپنے بہت سے دوستوں کو اسی مرض میں مبتلا ہو کر واصل بہ ادارت ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہاں کی دوائیں بھی اشتہارات پر اور اخبار بھی اشتہارات پر چلتے ہیں۔ ان اخباروں کی "سنسنی خیزی" ان کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ خبروں میں سنسنی زیادہ خبر کم اور صداقت موہوم ہوتی ہے۔ جو اخبارات اس دائرہ سے باہر ہیں۔

ان کو یا تو گھر کا زمیندار کہا جاتا ہے یا انقلاب پسند۔ اخباروں کے بعد رسالوں کا نمبر آتا ہے ہر محلہ سے ایک رسالہ نکلتا ہے۔ کسی زمانے میں لاہور محض علمی ادبی رسدگی کے لئے مشہور رہتا تھا۔ مگر اب بمبئی کے بعد اب سے زیادہ فلمی لٹریچر لاہور پیش کر رہا ہے یہ رسالے ایڈیٹر کے نام سے زیادہ فلم اسٹاروں کی تصاویر سے چلتے ہیں۔ اور ان میں کا ہر رسالہ اس قدر کثیر الاشاعت ہوتا ہے کہ کسی کی تعداد اشاعت کا اعتبار کے دائرہ میں محدود رہنا ممکن نہیں رہا ہے۔ رسالوں کی اس وبائے عام میں اب بھی چند ایسے ہیں جن کو اردو کی تاریخ میں ہمیشہ نمایاں جگہ حاصل رہے گی۔

لاہور میں ادبی چرچے بھی کافی ہیں۔ ادبی پرچے اور ادبی چرچے ان دونوں نے مل جل کر لاہور کو اردو کی منڈی بنا رکھا ہے۔ جہاں پنجابی بول بول کر اردو کی دیوانہ وار خدمتیں انجام دینے کا سلسلہ جاری ہے۔ کہیں مشاعرے ہو رہے ہیں کہیں مباحثے کہیں مقالات پڑھے جا رہے ہیں، کہیں مضامین چھپ رہے ہیں۔ اردو اگر اب کہیں زندہ نظر آتی ہے۔ تو اسی لاہور میں جس کو پنجاب کا دارالسلطنت کہا جاتا ہے۔ اور جو زبان والوں اور اہل زبان کی زباں درازیوں کا نشانۂ ملامت بنا ہوا ہے۔ اردو کہاں پیدا ہوئی۔ کہاں پروان چڑھی۔ یہ سب داستانیں تو پرانی ہیں۔ مگر اردو کو اب پنجاب کے پانچوں دریا مل کر آب حیات پلا رہے ہیں۔ اور پنجاب ہی کے بل بوتے پر یو۔ پی کی یہ نازوں پلی زندگی کی سانسیں لے رہی ہے۔ آپ نے اگر باہر سے لاہور جا کر اپنی اردو کی اجارہ داری پر ذرا بھی شیخی بگھاری تو پنجاب وہ قلعی کھولے گا کہ آپ خود گھبرا کر پنجابی بولنے لگیں۔ لہٰذا اس سلسلہ میں بھی ذرا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

آپ کو لاہور کے گلی کوچوں میں ایک نہ ایک ادبی رسالے کا دفتر اور ایک نہ ایک ادبی انجمن کا سائن بورڈ ضرور نظر آئے گا۔ تاکہ آپ شرم سے سر جھکا کر پنجاب کی اس اردو نوازی کا اعتراف کرتے ہوئے گزر جائیں۔ اور اگر آپ نے ذرا بھی کسی کے کسی محاورے کی غلطی پکڑی تو وہ ایسے بے محاورہ ہو جائیں گے۔ کہ آپ کو اپنی جان کے لالے پڑ جائیں لہٰذا اس سلسلہ میں بھی ذرا اپنی حدوں میں رہنے کی ضرورت ہے۔

لاہور جا کر چلے آنے والوں کے لئے تو خیر اتنی ہی معلومات بہت کچھ مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ مگر بہت سے خانہ بدوش ایسے بھی ہیں جو لاہور اس بدنیتی کے ساتھ جاتے ہیں کہ وہاں جا کر رہ ہی جائیں گے۔ اس سلسلہ میں بھی اس خاکسار نے کچھ نہ کچھ تجربات حاصل کئے ہیں، اس لئے کہ اس ہیچمدان کی نیت میں بھی یہی فتور تھا۔ لاہور جا کر مستقل سکونت اختیار کرنے والوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے سامانِ سفر میں ایک خیمہ بھی ساتھ رکھیں۔ اس لئے کہ لاہور میں اور تو اللہ کا دیا سب کچھ ہے ذرا مکانات کی قلت ہے یعنی جس قدر مکانات ہیں۔ وہ خود لاہور کے لئے ناکافی ثابت ہو رہے ہیں ایسی صورت میں یہ تو ممکن ہو سکے گا۔ کہ آپ لاہور کے قریب کسی میدان میں اپنا خیمہ لگا کر مالکانِ مکان کو اپنے اوپر رحم کھانے کا موقع دیں اور شاید آپ کو سال دو سال کے بعد کوئی مکان نما چیز کرایہ پر رہنے کے لئے مل جائے۔ لیکن لاہور پہنچتے ہی مکان مل جانے کا خیال ذرا خام سا نظر آتا ہے۔ خانہ بدوش کی صحیح تعریف بھی یہی ہے کہ وہ اپنے کندھوں پر اپنا گھر لئے ہوئے گھومے۔ لہٰذا جہاں اور سب کچھ ہے۔ وہاں ایک خیمہ بھی سہی کم سے کم مکان نہ ملنے کی صورت میں آپ کسی دوست کے لئے موت کا فرشتہ یا خودکشی کا سبب تو ثابت نہ ہوں گے۔ دوسری چیز جو لاہور میں

نایاب ہے - وہ ملازم ہیں - بلکہ اگر آپ ملازمت اختیار کرنے ہی کی نیت لے کر جائیں، تو خود ملازم رکھنے سے زیادہ فائدے میں رہیں گے - وہاں آقا گھاٹے میں اور ملازم فائدے میں رہتا ہے - اگر آپ اپنے وطن کا ملازم لے کر جائیں گے - تو وہ لاہور پہنچ کر خود اپنی قیمت کا اندازہ کرے گا - اور آخر کار ایک دن آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ کسی دوسری جگہ چارج لے چکا ہے - جہاں اس کی تنخواہ خود آپ کی تنخواہ سے دس روپے زیادہ ہی ہے - گویا وہاں پہنچکر ملازم ڈھونڈھنا تو بیکار ہے ہی گھر سے نوکر لے جانا بھی کچھ زیادہ مفید نہیں ہے - اپنا کام خود کرنے کی عادت ڈالئے، اپنے کام میں شرم کی کوئی بات نہیں - بلکہ آج ہی اپنے والد کو ایک خط لکھئے - جسمیں اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے کے فوائد پانچ صفحات میں بیان کیجئے - لاہور میں آپ کو دھوبی بھی اس ارزانی اور آسانی کے ساتھ نہ مل سکیں گے کہ آپ ان سے دستر خوان تک دھلوا لیا کریں - بمشکل تمام اگر دھوبی مل گیا - تو وہ آپ کو بہت جلد اس بات کی ٹریننگ دیدے گا - کہ آپ غیر ضروری اور روزمرہ کے استعمال کے کپڑے خود ہی صاف کر لیا کریں - البتہ خاص خاص کپڑے، کپڑوں کی قیمت کے لگ بھگ دھلائی دے کر آپ دھوبی صاحبان سے دھلوا سکتے ہیں - مگر اس قسم کی تمام دقتیں آپ کو شروع شروع میں محسوس ہوں گی -

اس کے بعد تو آپ کو محسوس ہوگا کہ باوجود ان تمام دقتوں کے لاہور میں ایک زندگی ہے - ایک امنگ ہے، ایک حوصلہ ہے - البتہ ایک بات ذرا بری ہے کہ خدا بُرے وقت سے بچائے - خدا کسی کو لاہور کی موت نہ دے - زمین کا مول تول کرنا، اور قبر کی قیمت چکانا .... مگر لاحول ولا قوۃ -

اس بدشگونی کی آخر کیا ضرورت ہے۔ لاہور زندگی کے لئے مشہور ہے۔ اس نے موت کے سلسلہ میں تو کسی شہرت کا خود بھی دعویٰ نہیں کیا ہے۔

حق لاہوری نمک

بہت سی باتیں بلاوجہ بھی ہوا کرتی ہیں۔ اور اگر سچ پوچھئے تو زیادہ تر ایسی
باتوں کی کوئی وجہ نہیں ہوا کرتی۔ اگر کوئی بات کسی وجہ سے ظہور میں آئے تو وہ
بات ہی کیا ہوئی۔ اچھی خاصی تجارت ہوئی۔ کوئی شخص اگر خوبصورت ہے۔ اور ہم
کو بھلا لگتا ہے۔ تو اس میں ہمارا کونسا احسان ہے وہ ہر ایک کو بھلا لگ سکتا
ہے۔ اس کی خوبصورتی بھلا لگنے کی وجہ ہوئی وہ خوبصورت نہ ہوتا۔ اور بھلا
لگتا تو ایک بات بھی تھی۔ باپ اور بیٹے کی محبت ہی کو لے لیجئے اور انصاف سے
کہیئے کہ یہ محبت ہے یا لین دین؟ اور یہ محبت ہے یا مجبوری؟ باپ بیٹے سے
محبت نہ کرے گا۔ تو جائے گا کہاں۔ بیٹا باپ کو نہ چاہے گا تو جائے گا کیسے؟
بڑی دھوم ہے۔ عاشق اور معشوق کی محبت کی۔ آخر یہ بات کیا ہوئی۔ عاشق تو

معشوق کو چاہنے کے لئے بالکل اسی طرح مجبور ہے جس طرح بینک کا خزانچی چیک کیش کرنے کے لئے، یا دفتر کا کلرک سرکاری کاغذات کی خانہ پُری کرنے کے لئے۔ ان میں سے کوئی ایک بات بھی بلا وجہ نہیں۔ اور چونکہ ہر بات کی کوئی نہ کوئی وجہ موجود ہے لہذا یہ باتیں باتوں سے زیادہ کاروباری نظر آتی ہیں۔

ہمیں تھانہ بھون سے محبت ہے۔ ہونا ہی چاہیئے وطن جو ٹھہرا بھوپال پسند ہے۔ کیسے نہ ہو بچپن وہیں گذرا ہوش کی آنکھیں وہیں کھُلیں۔ لکھنؤ میں ہمارے لئے ایک دلکشی ہے۔ اس لئے کہ اسی شہر میں ہیں وہ گلیاں جوانی جن میں کھوئی ہے۔ اور اب تک اسی شہر کو اپنا وطن ثانی بنائے ہوئے ہیں۔ مگر یہ لاہور میں جو ہمارے لئے، ایک کشش ہمیشہ سے تھی۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ لاہور کو دیکھنے کا اتفاق بھی نہیں ہوا تھا۔ لاہور میں کوئی عزیز بھی نہ تھا۔ صرف لاہور سے ایک نسبت یہ تھی کہ ہمارے نام بچوں کا رسالہ 'پھول' آیا کرتا تھا۔ اور اسی پھول سے بچپن میں یہ عالم تھا کہ ہم گویا لاہور کو اپنائے ہوئے تھے۔ کیسا ہوگا یہ ہمارا لاہور؟ بڑا اچھا ہوگا۔ اس بھوپال سے تو ضرور اچھا ہوگا۔ آخر یہ ابا نے بھوپال میں جو نوکری کر رکھی ہے۔ اگر لاہور میں کرتے تو ان کا کیا نقصان تھا۔ میں بڑا ہو کر لاہور ہی میں رہا کروں گا۔ یہ تھا لاہور کی غائبانہ کشش کا بچپن۔ جوانی آئی تو پھول کے بجائے 'مخزن' اور 'نیرنگ خیال' سے دلچسپی بڑھی اور ان رسالوں میں لکھنا بھی شروع کیا۔ لاہور کے لئے اب بھی دل میں ایک بیتاب تمنا تھی۔ کاش لاہور جانے کا موقع ملے۔ حفیظ جالندھری کو دیکھیں۔ تاجؔ سے ملیں۔ پطرس سے ملاقات ہو۔ یہ تڑپ نشوونما پاتی رہی۔ جن سے ملنے اور جن

کو دیکھنے کی خواہش ہوسکتی ہے۔ ان کی تعداد روز بروز بڑھتی رہی۔ کبھی ڈاکٹر اقبال کی زیارت کو دل چاہتا۔ کبھی سر عبدالقادر سے ملنے کی تمنا ہوتی۔ گویا کہ لاہور کی کشش اپنا دام روز بروز وسیع کر رہی تھی۔

سنہ اچھی طرح یاد نہیں حالانکہ یاد رکھنے کی چیز تھی۔ ہمارے خالہ زاد بھائی اور بیگم صاحبہ کے چچا ڈاکٹر محمد عمر صاحب نے ہمکو لاہور چلنے کی دعوت دی۔ دل باغ باغ ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب کے متعلق رائے تو خیر ہماری ہمیشہ سے بہت اچھی تھی۔ مگر یہ خیال نہ تھا کہ وہ اس قدر بلند قسم کے آدمی ہیں۔ جی چاہا کہ ان کی پیشانی چوم لیں۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر نچادیں۔ مگر ضبط سے کام لیا کہ وہ کہیں ڈاکٹر نہ جانے کیا سمجھ بیٹھیں۔ اور لاہور کے بجائے بریلی یا آگرہ کی سیر نہ کرادیں۔ مختصر یہ کہ لاہور آئے۔ وہ اپنی سسرال میں اور ہم اپنے نادیدہ دوست اسلم صاحب کے یہاں ٹھہرے۔ پیچھے صاحب لاہور پہنچ گئے۔ ڈاکٹر اقبال سے مل لیئے۔ سر عبدالقادر کو دیکھ لیا۔ امتیاز علی تاج کو دیکھا۔ حفیظ جالندھری کو پہلے ہی کانپور میں دیکھ چکے تھے۔ حکیم یوسف حسن سے لکھنؤ میں کئی بار کئی بار ملنے کا اتفاق ہوچکا تھا۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ سب دراصل بہانے تھے لاہور کی کشش ان حضرات کو دیکھنے اور ان سے بار بار ملنے کے بعد بھی بے اثر تو بے اثر ذرا سی بھی کمزور تک ثابت نہ ہوئی۔ ڈاکٹر محمد عمر صاحب نے شاہی مسجد اور جہانگیر کے مقبرے سے لے کر شالامار باغ تک سب ہی کچھ دکھا ڈالا۔ مگر جب لاہور سے واپس ہوئے تو معلوم یہ ہوتا تھا کہ جیسے لاہور کو ابھی دیکھا ہی نہیں ہے۔ لکھنؤ جاکر موازنہ لکھنؤ و لاہور لکھا۔ لکھنؤ والے پنجابی سمجھنے لگے۔

دوسری مرتبہ ڈاکٹر محمد عمر صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی محمد عثمان صاحب احمدی کے ساتھ لاہور آنے کا موقع ملا۔ اور اسی طرح لاہور کو دیکھ کر جیسے لوگ کلکتہ یا بمبئی دیکھا کرتے ہیں چلے گئے۔ ایک بات یہاں اچھی یاد آئی۔ ہندوستان میں لاہور کے علاوہ اور بھی بہت سے موٹے موٹے شہر ہیں۔ مثلاً کلکتہ۔ بمبئی کراچی۔ حیدرآباد۔ دہلی وغیرہ۔ مگر اب تو خیر ہم آدمی ہیں معصوم نہیں کیا بات تھی۔ کہ بچپن میں بھی کبھی کسی شہر کو دیکھنے کے لئے اس قدر دل نہیں چاہا جس قدر لاہور دیکھنے کی تمنا تھی۔ بہرصورت دوسری مرتبہ بھی آئے اور محض سیر کر کے چلے گئے۔

تیسری مرتبہ تو کمال ہی ہو گیا۔ اب شاید لاہور کو بھی ہمارے عشقِ صادق کی اطلاع ہو چکی تھی۔ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں ملازم تھے اور بمبئی کی ایک فلم کمپنی سے ملازمت کے لئے مسلسل خط و کتابت ہو رہی تھی۔ کہ یکایک لاہور سے پنچولی آرٹ پکچرس کا خط ملا کہ اگر تم ہمارے اسٹوری رائٹر کی حیثیت سے آنا چاہتے ہو۔ تو انٹرویو کر جاؤ۔ نوکری کا کس مسخرے کو یقین تھا۔ مگر انٹرویو کے بہانے لاہور کی سیر ——— لکھ دیا کہ آ رہے ہیں۔ لاہور پہنچے۔ اب لاہور کو پسند کرنے اور لاہور کی طرف کھنچنے کی بہت سی وجہیں پیدا ہو چکی تھیں۔ مثلاً ریڈیو کے بہت سے یارانِ تیز گام نے لاہور کو جا لیا تھا۔ ملک حبیب احمد لاہور آ چکے تھے۔ میاں لطیف الرحمن لاہور آ گئے تھے۔ اور لکھنؤ ویسے بھی سونا سونا سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک دم جو حبیب کے یہاں جا کر سامان اتار رہے تو وہ حیران۔ لطیف بھونچکا کہ یہ شوکت ہمارے لاہور میں کیسے۔ پنچولی والا قصہ بتایا تو دونوں کھل گئے۔ ایک نے کہا۔ یار اگر پانچ روپیہ ماہوار خشک تنخواہ ملے تو بھی نہ چھوڑنا۔ دوسرے نے مشورہ دیا کہ آنریری

عہدہ تک قبول کر لینا۔ مگر ہوا یہ کہ دوسرے دن واقعی نوکری کے کنٹریکٹ پر جانبین کے دستخط۔ لکھنؤ جا کر بچوں کو لے آئے اور میورو ڈ پر ایک مکان جس پر ہمیشہ کوٹھی کی تہمت لگائی گئی ہے کرایہ پر لے لیا۔

لیجئے صاحب اب ہم باقاعدہ باشندگان لاہور میں شامل ہو گئے۔ اور لاہور کی کشش آخر رنگ لا کر رہی جس شہر میں گنتی کے صرف دو، یعنی واقعی دو دوست ہوں۔ اور ایک رشتہ دار، رشتہ بھی کیا۔ خسر کے خسر، سبحان اللہ، بلکہ نورٌ علیٰ نور، باقی سب اجنبی۔ نہ کسی کی زبان ہم سمجھیں نہ ہماری بات کسی کی سمجھ میں آئے۔ تانگہ والے سے بار ہا کہا۔ کہ ریڈیو اسٹیشن پہنچا دو۔ اگر وہ بہت ہم سخن فہم ہوا تو ریڈیو اسٹیشن چھوڑ آیا۔ اور غالب کا طرفدار نکلا تو ملکہ کے بُت۔ نسبت روڈ اور نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھنوائی۔ مگر اب تو لاہور سے نباہنا ہی تھا۔ بیوی بھی خوش تھیں کہ کم سے کم لاہور پہنچکر پردہ تو اٹھا۔ بچے روز اپنی ماں کے ساتھ ہوا خوری کے لئے جانے لگے۔ اور ہم بقول پطرس صاحب کے بھنچولی نکل آنے کی وجہ سے بھنچولی میں مبتلا ہو کر رہ گئے۔

یکم فروری ۱۹۴۳ء کو بھنچولی آرٹ پکچرس میں چارج لیا۔ میورو ڈ پر قیام اور مسلم ٹاؤن میں کام۔ روزانہ پانچ میل کے قریب جانا اور پانچ میل آنا۔ دس میل یومیہ کی سائیکل بازی سے تندرست سے تندرست آدمی دق ہو سکتی ہے۔ مگر یہاں اس کا الٹا ہی اثر ہوا۔ بھوک جو کبھی نہ لگتی تھی اور کھانا محض عادت کے طور پر کھایا کرتے تھے۔ اب خوب لگنے لگی۔ اور کھانا کھانا عادت کے بجائے ضرورت بن گیا۔ خیال تھا کہ اتنی روزمرہ کی سائیکل بازی کے بعد اس قدر خستہ و خراب

ہو جایا کریں گے کہ دنیا میں کسی کام ہی کے نہ رہیں گے۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی۔ کہ دس میل کی اس ورزش کے بعد بھی حوصلے پست نہ ہوتے تھے۔ لکھنؤ میں تو گھر پر بیٹھے ہی بیٹھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ نہ جانے کتنا بڑا سفر طے کر کے بیٹھے ہیں نہ کسی کام میں جی لگتا تھا۔ اور نہ کسی محنت کی ہمت عموماً پیدا ہوتی تھی۔ مگر یہاں روز کچھ نہ کچھ لکھنا اور کثرت سے پڑھنا۔ اس ایک سال کے قیام لاہور میں جتنا ہم نے پڑھا ہے۔ اگر ہمیشہ اتنے ہی مطالعہ کی توفیق خدا دیتا تو نہ معلوم کتنے بڑے بحر العلوم ہوتے۔ پھر لکھا بھی اتنا ہے کہ زندگی بھر اتنا نہ لکھ سکیں گے۔

ملک حسیب احمد کا مکان ہمارے مکان سے ملا ہوا تھا۔ اور وہ روز یہی شکایت کرتے تھے کہ تم رات بھر صحن میں بجلی جلاتے ہو اور ہم اس کی روشنی کی وجہ سے سو بھی نہیں سکتے۔ گویا "شہر والے اپنے دیئے گل کریں بنو کی آنکھیں دکھتی ہیں" ان کو حیرت تھی۔ کہ یہ شخص اتنی محنت کس طرح کرتا ہے۔ کہ دس میل کی منزل طے کرنے کے علاوہ دن بھر دفتر میں سر کھپاتا ہے اور پھر رات کو لکھنا پڑھتا ہے۔ مگر ان کو کیا معلوم کہ ان سے زیادہ حیرت خود ہم کو تھی۔ وہ صرف دفتر کے اوقات اور دس میل کے فاصلہ کو مدنظر رکھتے تھے۔ حالانکہ اس کے علاوہ اور کام بھی تھے۔ مثلاً بیگم صاحبہ کو انار کلی لے جا کر ملائی کی برف کھلانا۔ بچوں کو ڈاکٹر کے یہاں لے جانا سینما دیکھنا اور دکھانا۔ مشاعروں اور ادبی صحبتوں میں شرکت کرنا وغیرہ۔ اور سب سے بڑا کام تو اب سنئے۔

لاہور آنے کے چوتھے ہی پانچویں دن لوہاری دروازہ کے باہر ایک کتابوں کی دوکان میں خود اپنی ہی ایک کتاب کی تلاش میں پہنچ گئے۔ اور پکڑے گئے۔ اس دوکان کا نام "اردو بک اسٹال" ہے۔ اور اس کے مالک محمد ظہیر صاحب نے اپنی ہنستی

ہوئی آنکھوں سے تاڑ لیا کہ یہی وہ شخص ہے۔ جس کی ان کو کھوج تھی۔ چنانچہ اب آپ کتاب کے دام نہیں لیتے۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ مصنف سے اس کی تصنیف کے دام لینا ذرا شرافت سے علیحدہ سی بات ہے۔ بلکہ لیمن کی بوتلیں کھلیں، سنگتروں کے عرق نکالے گئے۔ پان آئے، سگریٹیں آئیں اور اچھی خاصی مہمان نوازی شروع ہو گئی۔ دوسری مرتبہ گئے تو پھر وہی تواضع۔ تیسری دفعہ ایک کتاب کی فرمائش۔ اب باقاعدہ آمد و رفت شروع ہو گئی۔ اور معمول یہ بن گیا۔ کہ گھر سے پانچ میل مسلم ٹاؤن جانا۔ مسلم ٹاؤن سے پانچ میل لوہاری دروازہ جانا وہاں سے تین میل گھر آنا۔ گویا قید تو دی ہی مشقت کچھ اور بڑھا دی گئی۔ رفتہ رفتہ "شیش محل" نامی کتاب کا ان سے کنٹریکٹ ہو گیا۔ اس کے علاوہ ان کے رسالہ کتاب کے لئے منتخب مضامین کی ذمہ داری لے لی خصوصاً کتابوں پر تنقید و تبصرہ اپنے سر لے لیا شیش محل کی تصنیف الگ، کتابوں کا پڑھنا الگ ان پر ریویو کرنا الگ، ریڈیو کے لئے تقریروں اور ڈراموں کا لکھنا الگ، ان ڈراموں میں پارٹ کرنا الگ، دفتر کا کام الگ اور پھر دس بارہ میل روز کی سائیکل بازی الگ، مگر صحت روز بروز اچھی ہوتی رہی، کام کرنے سے کبھی تھکن محسوس نہ ہوتی۔ حالانکہ اتنے کام کا تصور کر کے اب چکر آنے لگتا ہے۔

"شیش محل" ختم کی تو ایک ناول "بکواس" شروع کر دیا، اُسے ختم کیا۔ تو "سنی سنائی" نامی ایک کتاب، یعنی اپنے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ مرتب کیا۔ پھر لاہور رسالوں کی منڈی تو ہے ہی لاکھ ایڈیٹر صاحبان سے چھپ کر رہے مگر ان حضرات کی قوتِ شامہ اس قدر ذکی الحس ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ ایک آدھ صاحبان یہ کہتے

ہوئے آہی جاتے تھے کہ ؎

"تو جہاں جا کے چھپا ہم نے وہیں دیکھ لیا"

ان حضرات کو ٹالنا ایک مستقل فن ہے، اور انکار کرنا تو اتنی بڑی جرأت کا کام ہے۔ کہ اس پردیس تو پردیس شاید اپنے گھر میں کبھی ایسی جرأت ہم سے ممکن نہ ہو مختصر یہ کہ ان حضرات کے لئے بھی معمولی نمبروں کے لئے نہ ہی، سالناموں کے لئے کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑا۔ اور آپ کو شاید معلوم نہیں ہے۔ کہ لاہور میں ہر رسالہ کا سالنامہ ماہوار شائع ہوا کرتا ہے۔ ذوقِ ادب کی فراوانی نے سال کے ہر مہینہ کو ایک سال بنا رکھا ہے۔ تعجب ہے کہ اب تک لاہور سے کوئی روزانہ اخبار ایسا جاری نہیں ہوا ہے جس کا نام سالنامہ ہو۔ قصہ مختصر یہ سالنامے اور یہ ماہنامے بھی ہو گئے۔ اب ایک طرفہ تماشہ ملاحظہ ہو کہ چونکہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کو حال ہی میں چھوڑ کر آئے تھے۔ لہٰذا وہاں کی فرمائشوں کی بھرمار الگ تھی۔ وہاں کے ہر محکمہ کا انچارج اپنا دوست اور ہر ایک اپنی اپنی جگہ اپنے حقوق کی طرف سے کچھ ضرورت سے زیادہ مطمئن۔ کوئی لکھتا ہے۔ کہ بعض عورتوں کے پروگرام کے لئے بس ابھی قلم اٹھا کر ایک اسکیچ لکھ دو، کسی کا تقاضہ ہے کہ بچوں کے لئے کوئی تمثیلچہ طولِ عمرہ لو، پیسی ڈاک بھیج دو۔ ڈرامہ والے صاحب ایک مستقل آپرا چاہتے ہیں۔ تقریر والے دوست مصر ہیں۔ کہ دریائے نیل کی کہانی "بھیج دو" وہ تو کہیئے کہ خدا کا شکریہ ہے۔ کہ اُس زمانہ میں ان تمام فرمائشوں پر غور کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ اور فرمائشیں نہ معلوم کیوں کر پوری ہوتی رہتی تھیں۔ اگر کسی دن اپنی بساط، وقت کا اندازہ، کام کی مقدار، اور مختلف مصروفیات کو سامنے رکھ کر کہیں غور کر لیتے تو نہ جانے دل کی حرکت بند ہو جاتی یا

دماغ پر کوئی ایسا ناگوار اثر پڑ جاتا کہ پھر دماغ کو زحمت دینے کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی۔ مگر اس زمانہ میں تو نہ جانے کس بلا کی امنگ اور کس بلا کا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا کہ جس قدر کام سر پڑتے جاتے تھے ۔ وہ سب ہی خدا کے فضل سے انجام ہوتے رہتے تھے ۔" بکواس " نامی ناول لاکھ بکواس سہی مگر پھر بھی اپنے نام سے شائع ہونے والی ایک کتاب تھی۔ دو سو چالیس صفحات جس کتاب کا حجم ہو وہ صرف چار دن میں لکھی گئی۔ یہ چار دن تعطیل کے نہ تھے ۔ پنچولی آرٹ پکچرس میں برابر شوٹنگ ہو رہی تھی ۔ شیریں فرہاد کے مکالمے اور لوجی کے گانے بھی دفتر میں لکھے جاتے تھے۔ دس بجے دن سے شام کو سات بجے تک اسیٹھ دل سکھ صاحب پنچولی کا حق نمک ادا کرتے اس کے بعد یہ مشغلہ بھی جاری رہتا تھا۔ اب خود ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیونکر ہو سکتا ہے ۔

مختصر یہ کہ لاہور کی آب و ہوا جسم تو جسم دماغ کے لئے بھی ایسی راس آئی ۔ کہ ادبی سیلاب ہی گویا امنڈ آیا ۔ اور نواور ظہیر صاحب کے رسالہ" کتاب " کے لئے ایک نیا باب شروع کیا ۔ یعنی " مرطالچہ " آپ حیران ہوں گے کہ یہ " مرطالچہ " کیا بلا ہے ۔ جی ہاں یہ ایجادِ بندہ ہے یہ گویا " مرطالعہ کا روزنامچہ " اس تفصیل کا اجمال ہے ۔ اس باب میں ہم اپنے روزمرہ کے مطالعہ کا روزنامچہ لکھا کرتے تھے ۔ تاریخ وار ایک تاریخ بھی ناغہ نہ ہوئی تھی ۔ گویا روز نئی نئی کتابیں پڑھتے تھے۔ اور پھر اُن کتابوں کے متعلق اپنے تاثر کو قلمبند کرتے رہتے تھے ۔ اس باب نے تھوڑے ہی دنوں میں اتنی مقبولیت حاصل کر لی ۔ کہ مصنفین نے براہ راست اپنی تازہ تصانیف ۔ اس درخواست کے ساتھ بھیجنا شروع کر دیں کہ ان کتابوں

کو بھی اپنے "مطالعہ" میں شامل کر لو۔

ان تمام باتوں کو عرض کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے۔ کہ ؎

وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہوگا

اگر خود ستائی ہی مقصود ہوتی تو اب بھی ہم وہی ہیں، آخر بڑے تیس مار خاں ہیں نواب کیا مجبوری ہے۔ مگر نہیں لاہور کو چھوڑنے ہی یہ تمام مشاغل بھی ایک ایک کرکے چھوٹ گئے۔ اور پھر ادبی دنیا میں تلاش گمشدہ کے اشتہار دیئے جانے لگے۔ کہ شیش محل اور بکواس کا مصنف یکایک غائب ہو گیا ہے۔ اگر کسی کو پتہ چلے تو مشتہر کو اطلاع دے کر ثواب دارین حاصل کرے۔ دراصل مقصد اس تمام طومار کا صرف یہ ہے کہ ہم تو ہمیشہ سے وہی ہیں۔ جو ہمیشہ سے تھے۔ اور ہمیشہ وہی رہیں گے جو ہیں البتہ یہ لاہور کا فیض تھا جس نے یہ تمام کام ہم سے لئے اور یکم فروری ۱۹۲۳ء سے ۲۰ جنوری ۱۹۲۴ء تک تقریباً ایک سال کا زمانہ اس شہر میں شاید ہی ہم بھول سکیں۔ پھر حیرت یہ کہ ۲۰ جنوری ۱۹۲۴ء کو لاہور چھوڑتے ہی ہم بالکل وہی تھے۔ جو یکم فروری ۱۹۲۳ء سے پہلے تھے۔ نہ وہ سرگرمی نہ وہ ہماہمی نہ وہ امنگ نہ وہ ترنگ۔ یا تو واقعی لاہور کی آب و ہوا کی یہ کرامت ہے ورنہ لکھنؤ کی آب و ہوا میں افیون کے اجزا ضرور شامل ہیں۔

اس سلسلہ میں بیگم صاحبہ کا نظریہ بھی گرہ میں باندھ لیجئے۔ فرماتی ہیں۔ کہ کچھ نہیں یہ سب تمہارے دوستوں کا قصور ہے۔ لاہور میں نہ کہیں کے آنے کے نہ جانے کے۔ نہ کوئی تمہارے پاس آتا تھا، نہ تاش کھیلنے کا مشغلہ تھا۔ نہ کوئی تفریح مجبوراً آدمی بن گئے تھے۔ اور لکھنے پڑھنے میں وقت گذارا کرتے تھے۔

لکھنؤ میں تم کو گھر سے مطلب ہی کیا ہے۔ ہزاروں بہانے کرتے ہو کہ آج یہ جلسہ ہے
آج یہ میٹنگ ہے۔ آج فلاں جگہ مشاعرہ ہے۔ کبھی کچھ ہے کبھی کچھ۔ لکھیں پڑھیں۔ کیا
تمہارے فرشتے؟ اب بتائیے کہ ان بیگم صاحبہ کو کیوں کر سمجھایا جائے کہ لاہور میں
بھی ہمارے دوست تھے۔ بلکہ لاہور کے ادبی ہنگامے تو لکھنؤ سے کہیں زیادہ تھے۔
لاہور کی آبادی اور لاہور کی ادبی انجمنوں کی تعداد تقریباً برابر ہی ہے۔ اگر وقت
ضائع کرنے کا سوال ہے تو لاہور میں بھی تاش کا ایک سے ایک کھلاڑی پڑا ہوا ہے۔
جس سال ہم لاہور میں تھے۔ تقریباً تمام سال ایک کارنیوال ہی وہاں موجود رہا۔
ویسے بھی بے شمار سینما ہیں۔ اور تقریباً نصف درجن سینما ہاؤسز کے پاس ہماری جیب
میں رہتے تھے۔ دوسروں کو پاس دینے والا آخر خود کیوں مجبور رہتا۔ ریڈیو کا تمام
عملہ اپنا دوست اور سب کو یہ شکایت کہ کبھی ملتے ہی نہیں ہو۔ پنچولی آرٹ پکچرس
کے سیٹھ صاحبان سے لے کر ڈائرکٹر صاحبان تک سب کو شکایت کہ یہ یو۔پی کا
جانور عجیب وحشت مآب ہے۔ بس اپنے کام سے کام، نہ کسی تفریح کا ہے۔ نہ
ضابطہ کے اوقات کے علاوہ کبھی کسی دلچسپی میں نظر آتا ہے۔ ایک آدھ مرتبہ تاش
بھی کھیلے اگر چاہتے تو اسی مشغلہ کو نہایت آسانی کے ساتھ روزمرہ کے پروگرام میں
شامل کر لیتے۔ مگر ان میں سے کوئی بات بھی بیگم صاحبہ کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ وہ مقامی
اثرات اور کسی خاص آب و ہوا کی ہرگز قائل نہیں ہو سکتیں۔ ان کو تو عجیب اعتقاد ہے
اس خاکسار سے کہ یہ شخص اگر چاہے تو ہر جگہ اور ہر حال میں اپنے کو مفید ثابت
کر سکتا ہے۔ مگر دوسرا اعتقاد یہ بھی ہے کہ مفید ثابت کرنا ہی نہیں چاہتا۔
دوستوں کی مصیبت نہ کبھی ٹل سکتی ہے۔ نہ بیگم صاحبہ کے شوہر راہ راست

پا سکتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہوتی ہے ان بیویوں کی قوم میں کہ ہر بیوی خود اپنے شوہر کو اس کی کسی خامی یا برائی کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتی۔ بلکہ اس کی برائیاں اس کے دوستوں کے ماتھے جاتی ہیں۔ مرحوم رفیع احمد خاں ہائے میں کس قلم سے رفیع کو مرحوم لکھ رہا ہوں۔ مگر وہ تو ہماری زندگی کے ساتھ زندہ ہے۔ اس دنیا میں رہے یا نہ رہے۔ ہاں تو رفیع احمد خاں کی بیوی کے علاوہ اس سلسلہ میں خود ہم نے اپنے کسی دوست کی بیوی کو منصف مزاج نہیں پایا۔ رفیع احمد خاں نے اپنی بیوی کو لاکھ لاکھ یقین دلایا کہ شوکت کے متعلق تم ہرگز وہ رائے قائم نہ کرو جو میرے اور دوستوں کے متعلق قائم کی ہے۔ وہ نہایت سلیم الطبع۔ اور ہونہار قسم کا نیک آدمی ہے۔ کیا جواب دیا ہے ہماری بھابی نے کہ اگر وہ نیک تھے۔ تو تم سے کیوں کر ملاقات ہوئی۔ رفیع احمد صاحب ایسا حاضر جواب منہ دیکھ کر رہ گیا۔ مگر ہماری ان بھابی صاحبہ کو بھی کبھی کبھی یہ شک پیدا ہو جاتا تھا۔ کہ شاید ان کے شوہر نامدار فطرتاً بڑے شریف زادے واقع ہوئے ہیں اور ان کی تخریب میں ان کے دوستوں کا ہاتھ ہے۔

ہمارے ایک دوست اور بھی ہیں۔ جن کا نام لکھنا اس لئے خلاف مصلحت ہے کہ ابھی تک شادی نہیں ہوئی ہے۔ حالانکہ ویسے وہ قطعی طور پر اس قابل ہیں۔ کہ پوتے کھلائیں۔ مگر چونکہ شادی نہیں ہوئی ہے۔ لہذا نام لکھ کر ہم کیوں شادی نہ ہو سکنے کی ذمہ داری اپنے سر لیں۔ ان کے یہاں تو بیوی بچے نہیں ہیں۔ مگر یہ عجیب تماشہ ہے۔ ان کی بھاوج صاحبہ کی رائے یہ ہے کہ ان کا دیور یقیناً

ہاؤس آف کامنز کا ممبر ہو سکتا تھا۔ ادب کی طرف متوجہ ہو جاتا تو ٹالسٹائی کا جواب ہوتا۔ تجارت کرنے پر اتر آتا تو اس کے تجارتی جہاز امریکہ کے ساحلوں پر لنگر انداز نظر آتے اور تمام غیر ممالک کا روپیہ اس کے ہندوستانی بینکوں میں بھرا ہوتا۔ اگر مولوی ہو جاتا تو کل عالم اسلام پر اس کا فتویٰ چلتا۔ اگر عابد ہو جاتا۔ تو جنت الفردوس اس کو ڈھونڈھتی ہوئی لکھنو تک کا سفر کرتی۔ مگر کیا کیا جائے کہ ایسے جوہر قابل کا ستیاناس ان کمبخت دوستوں نے کر رکھا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اب ہفتوں گھر کا راستہ نہیں لیتا۔ کبھی کسی کے یہاں تاش کھیلتا ہوا پایا جاتا ہے۔ کبھی اس سے بھی گئی گذری حالت میں کسی اور جگہ۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ ان حضرت نے اپنی زندگی کچھ خانہ بدوش قسم کی بنا رکھی ہے۔ ہم لوگ جب سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو آپ ہم کو بھی اسی زندگی کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر ہم میں سے کوئی بھی بیوی بچوں والا ان کے کسی ایک مشورے کو بھی قبول کرلے تو چوپٹ ہی ہو جائے۔ نتیجہ یہ کہ ہم لوگ خود کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ مگر ان کی اس تخریب کی ذمہ داری سے اپنے کو نہیں بچا سکے۔ ان سے بچنے میں لاکھ کامیاب ہو جائیں، ان کی بھاوج صاحبہ کے نزدیک اب بھی وہ موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں۔ بشرطیکہ ہم ان کے دوست نہ ہوں۔

خیر یہ تو ایک عجیب ناگوار بحث چھڑ گئی۔ عرض کرنا یہ تھا کہ بیگم صاحبہ لاہور کی معتقد ہرگز نہیں ہیں۔ البتہ ہمارے دوستوں سے بے حد بدعقیدہ ہیں۔ کوئی آئی سی۔ ایس ہو۔ کوئی شمس العلماء ہو۔ کوئی بین الاقوامی شہرت کا مالک ہو۔ کوئی کتنا ہی بڑا آدمی ہو۔ لیکن اگر وہ ہمارا دوست ہے تو صرف شہد ہے۔ ایمان

ہائے غیب کا کیا علاج۔

خیر عورتوں کی اور عورت بھی بیوی۔ بیوی کی رائے بھی بھلا کوئی رائے ہے خود اس سلسلہ میں ہم نے ٹھنڈے دل سے غور کیا ہے۔ اور ہم تو صاحب لاہور کے قائل ہو چکے ہیں۔ زیادہ زور اس پر اس لئے نہیں دیتے کہ اگر واقعی بیگم صاحبہ کو یقین ہو گیا۔ کہ یہ سب لاہور کی کرامت ہے تو آج ہی بوریا بستر باندھ لاہور کی راہ لیں گی۔ کہ نوکری و دکری کچھ نہیں بس لاہور میں رہ کر لکھنا پڑھا کرو۔ گویا وہ لاہور کو شوہر کا مدرسہ بنا کر رہیں گی۔ اور اس طرح ہم اپنے لاہور سے اپنی طبیعت اُچاٹ کرنا نہیں چاہتے۔

لاہور کے دوران قیام میں علاوہ کتابوں، ڈراموں اور فیچر پروگراموں کے کچھ متفرق مضامین بھی لکھے تھے۔ جن میں ایک تو وہ ریڈیو کی تقریر ہے کچھ "ماہنوں سالناموں" کے لئے لکھے ہوئے مضامین ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ زیر نظر مجموعہ بھی اسی لاہور کے طفیل ہے۔ اور اسی لئے ہم نے اس کا نام "لاہوریات" رکھا ہے ممکن ہے کہ اس نام کو عام طور پر پسند نہ کیا جائے۔ مگر اس میں جو اعتقادی پہلو ہے۔ اگر اس کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ تو ہمارے اس جذبہ کی قدر کی جائے گی۔ کہ ہم کم سے کم احسان فراموش نہیں ہیں۔ لاہور سے جو عقیدت تھی اس کے حضور یہ ادنیٰ سا نذرانہ خود ہم کو بہت حقیر نظر آ رہا ہے۔ مگر نذر کی مقدار سے عقیدت کا وزن معلوم کرنے کا طریقہ صحیح نہیں ہے۔ نذر تو دراصل جام عقیدت سے چھلکے ہوئے چند قطروں کا نام ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس وقت میں سارے عقیدت کے کچھ جذباتی سا ہو چلا ہوں۔ لہذا اس ذکر کو یہیں پر ختم کر دیجئے۔ عقیدت کے سلسلہ میں زیادہ

سنجیدگی بھی ایک قسم کی کم ظرفی ہے۔

اس مجموعہ میں جتنے مضامین شامل ہیں۔ ان میں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ لاہور ریڈیو سٹیشن کی کچھ تقریریں بھی شامل ہیں۔ ریڈیو کی تقریروں کے سلسلہ میں بلا ضرورت بھی مگر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کہ مقرر یا محرر اس حد تک آزاد نہیں ہوتا جس قدر اس کو آزاد ہونا چاہیئے۔ ریڈیو والے بھی بیچارے مجبور ہیں کہ اپنے مقرر کو مجبور بنا دیا کریں۔ ان مضامین میں اگر یہ خاکسار کہیں کہیں پر آپ کو رسن بستہ نظر آئے تو اس بیچارگی کے سلسلہ میں ہمدردی کا آپ کا خیال ہے۔ مگر تمسخر ایک قسم کی سنگدلی ہوگی۔ ان مضامین میں ریڈیو کے اکثر مقررہ سلسلے ہیں۔ مثلاً ریڈیو کی طرف سے ایک سلسلہ چلا تھا "لڑائی جھگڑے"۔ اس سلسلہ کی کچھ تقریریں میں نے بھی کی تھیں۔ مثلاً "مسافروں کی لڑائی"۔ "ادیبوں کی لڑائی"۔ "خواہ مخواہ کی لڑائی"۔ ان تینوں قسم کی لڑائیوں میں جو فرق ہو سکتا ہے۔ وہ تو خیر عنوانات ہی سے ظاہر ہے۔ مگر کوشش کی گئی ہے۔ کہ بحیثیت مضامین کے بھی یہ تینوں مضمون اپنی اپنی جگہ پر ایک دوسرے سے علیحدہ رہیں۔ ریڈیو کے ایک دوسرے سلسلے میں بھی حصہ لینا پڑا یعنی "آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے" کے زیر عنوان شاعری، ضعف بصر، نور لب پر آجائے تو بصر، یہ تین تقریریں لاہور ریڈیو اسٹیشن سے ہوئیں۔ ان میں سے "شاعری" میں جو کچھ عرض کیا ہے اس سے ایک ہنگامے کی توقع بھی ہے اور ہنگامے کا انتظار بھی۔ اختلاف اگر کوئی بری چیز نہیں ہے۔ تو جدید شاعری سے ہمارے اس اختلاف پر بھی برا کہنا صحیح نہ ہوگا۔ یہ میرا عقیدہ ہے۔ کہ جن اوزان اور جس عروض کو لے کر یہ نئی شاعری سامنے آئی ہے۔ اس کی بنا پر وہ دیرپا ہونے کی

صلاحیت مشکل معلوم رکھتی ہے شعر اور موسیقی کو ایک دوسرے سے لاکھ علیحدہ رکھا جائے لیکن قطعاً غیر متعلق نہیں کہا جاسکتا۔ اگر شعر گایا نہ جاسکے۔ تو نثر میں شعر کہنا گانا اس سے بھی زیادہ آسان ہے۔ جو طریقہ جدید شاعروں نے اختیار کیا ہے۔ میں جدید شعرا کے بلندیٔ تخیل کا قائل ہو سکتا ہوں۔ ان کی بعد از فکر کی داد دے سکتا ہوں۔ ان کی سوجھ بوجھ کو سراہ سکتا ہوں۔ مگر میں اس چیز کو کبھی شعر نہیں کہہ سکتا جو شعر نہ ہو اور یہی وجہ ہے کہ معرعوں کی یہ شاعری میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اور اگر مجھ کو سمجھا دیا جائے تو میں اپنی اس سمجھ کو نا سمجھی کہنے کے لئے بھی ہر وقت تیار ہوں۔

ان مضامین کے علاوہ "پرابلم" نامی مضمون ایک قسم کی آپ بیتی ہے۔ گویا میں نے ہنس ہنس کر یا آپ کو ہنسانے کے لئے اپنی مصیبت بیان کی ہے اس مرحے شہر میں اب یہ مشقت روز افزوں ترقی پر ہیں۔ مگر ایک اجنبی کے لئے تو واقعی مصیبت ہی کا سامنا ہوتا ہے۔ جب کسی نئے شہر میں ہر معمولی سے معمولی بات پرابلم بن کر رہ جائے۔ پڑوسی کا عذاب لکھا تھا ایک رسالہ کے لئے مگر اس کو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے براڈ کاسٹ کرانا پڑا۔

اس مجموعہ میں ایک خاص مضمون اور بھی ہے جس کا نام ہے "لکھنؤ" اس مضمون کو لکھتے ہوئے کئی بار مجھے انیس کا یہ مصرعہ یاد آیا۔ ع

انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

کوشش تو کی ہے کہ آبگینوں کو ٹھیس سے بچایا جائے مگر واضح رہے کہ یہ آبگینے بھی لکھنوی ٹھہرے بغیر ٹھیس لگے بھی ٹوٹ سکتے ہیں۔ لکھنؤ کے متعلق

بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا تھا۔ مگر آزمائش کے طور پر پہلے صرف اسی قدر لکھا ہے اگر زندہ بچے تو لکھنؤ کسی آئندہ کتاب کا نام بھی شاید ہو جائے۔ لکھنؤ میں آج بھی وہ روایات زندہ ہیں جن کو قصہ کہانی کا درجہ دے دیا گیا ہے اور نئے جن کو بڑی بوڑھیوں کا جھوٹ سمجھا کرتے ہیں۔ مگر سوال تو یہی ہے کہ اس بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ دعا کیجئے کہ یہ بلی ذرا اور بردبار ذرا اور سخن شناس ذرا اور حلیم ہو جائے تو شاید یہ کہنے کی ضرورت نہ پڑے کہ "جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔"

مختصر یہ کہ یہ مجموعہ اب آپ کے سامنے ہے۔ اردو بک اسٹال کے مالک محمد ظہیر صاحب خود خوبصورت آدمی ہیں وہ کسی چیز کو بدنما تو پیش کر ہی نہیں سکتے۔ ان سے زیادہ حسین ان کا ذوقِ نفاست ہے۔ کاغذ کے اس قحط اور دوسرے سامانِ طباعت کی گرانی کے باوجود ان کا اصرار یہ ہے کہ یہ کتاب چھپ ہی جائے تو بسم اللہ اس کتاب نے مسودات پر مجھے نظر ثانی کا موقع بھی نہیں ملا ہے۔ یہ فرض اب کتاب پڑھنے والے حضرات خود میری طرف سے ادا کر لیں گے کہ اگر کسی مضمون سے اگر آپ میں سے کسی کو الجھن پیدا ہو تو اس سے مصنف کی عمر کا اندازہ نہ کر بیٹھئے گا۔ بلکہ کسی اور مضمون کو پڑھ کر اپنی الجھن کو دور کرنے کی کوشش کرنا زیادہ اچھا ہوگا۔ کتابت طباعت اور سرورق وغیرہ کے متعلق جملہ شکایات کے مستحق محمد ظہیر صاحب ہیں۔ اگر کوئی مضمون آپ کو پسند آ جائے۔ تو مصنف کے لیے دعائے خیر فرمایئے گا۔ ایک آدھ مضمون ذرا خطرناک بھی ہے۔ مثلاً "اگر میں بیوی ہوتا" اس قسم کے مضامین کو پڑھ کر جلد سے صفحات کو علیحدہ

کر لیجئے۔ چاہے گڑ کی ہاتیں مردانے سے زنانے میں پہنچ جائیں۔ اور پھر آپ انتقاماً اس مصنف ہی کا بائیکاٹ کر دیں۔

باقی امور کے متعلق ہم کو کوئی احتیاطی مشورہ نہیں دینا ہے سوائے اس ایک مشورے کے کہ اس کتاب کو اگر آپ نے قرض کے لین دین کے طور پر چلایا تو اس سے ظہیر صاحب یا مصنف سے زیادہ خود آپ کا نقصان یقینی ہے صاحبانِ ذوق کتابوں کی چوری کو ثوابِ ادب سمجھتے ہیں۔ خدا کرے ان کا یہ ثواب ظہیر صاحب کے لئے، اس خاکسار کے لئے اور خود آپ کے لئے عذاب ثابت نہ ہو۔ آمین۔!

پرابلم

جس کا وطن غریب الوطنی ہو وہ اپنے کندھے پر اپنا مکان تلاش نہیں کرتا بلکہ خانہ بدوشی پر ایسا اتراتا ہے۔ گویا اسی سے وطن کے تمام حقوق حاصل کر کے رہے گا معلوم نہیں یہ بات ہم نے انگریزوں سے سیکھی ہے۔ یا ہر انسان فطرتاً مگر غیر محسوس طریقہ پر انگریز ہوتا ہے۔ بہرصورت کچھ بھی ہو حال یہ ہے۔ کہ اٹھائیس سال تک لکھنؤ میں مہمان رہے وطن پردیس اور پردیس وطن بنتا رہا۔ بیگانگی یگانگت بن گئی۔ نام کے ساتھ تھانوی لکھ لکھ کر لکھنوی بنتے رہے۔ اسی مسافر خانہ میں پڑھے لکھے۔ اسی سرائے میں شادی بیاہ سے فارغ ہوئے۔ اسی ڈاک بنگلہ میں

بچوں کے باپ تک ہو گئے۔ اور عین اس وقت جبکہ لکھنؤ قریب قریب وطن بن چکا تھا، آوارگی خانہ بدوشی نے پھر کروٹ لی۔ پیروں کے سنیچر نے دشتِ غربت کی راہ لی اور اب جو آنکھ کھلی تو ہم لاہور میں تھے۔

لاہور آ کر پتا چلا کہ نئے آدمی، نئے جانور یہاں تک کہ اب کبھی پتا ملا۔ مرحلہ یہ تھا کہ اس نئی نویلی غربت کو پرائے بال بچوں کے ساتھ ٹھہر جا کر رہنا ہے۔ فکرِ آشیانہ کہئے یا آرزوئے دولت خانہ۔ مختصر یہ کہ سر چھپانے کی جگہ درکار تھی! ظاہر ہے۔ کہ ایک پردیسی اس قسم کے ناقصکارانہ کام نہیں کر سکتا، لہٰذا نئے ہمدردوں اور پرانے دوستوں سے اس کارِ خیر میں امداد کی مہم لے کر روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے جن بزرگ محترم کے دروازہ پر دستک دی گئی۔ ان سے مراسم کچھ ایسے ویسے نہ تھے۔ ہم دونوں تو ہم دونوں، ہمارے والد بھی آپس میں دوست تھے۔ ہم کو دیکھتے ہی "حامد" کا نعرہ بلند کر کے لپٹ گئے۔ پہلے کرسیاں منگئیں پھر سکنجبین کی بارش شروع ہوئی۔ پھر سگریٹ کی شاہ باری ہوئی۔ مختصر یہ کہ عجیب خوشگوار ملاقات تھی۔ دل خوش ہو گیا۔ پردیس میں ایسے ہمدم دیرینہ کا ملنا واقعی سبحان خضر کی ملاقات سے بہتر ہے۔ مکان تو مکان ان سے تو اگر ہم جان تک مانگیں تو یہ عذر نہیں کر سکتے، چٹکی میں پھیر دیں! پتہ نہ تھا ہوئے کہ مشکل راضی ہو سکے کہنے لگے، اچھا کھانا کل ساتھ کھاؤ۔

عرض کیا۔ بھائی جان میں مہمان بن کر نہیں آیا ہوں، وہاں جان چھوڑ کر آ رہا ہوں۔ یہ کہہ کر تمام حالات سنا دیئے۔ کہ اب مستقل طور پر یہیں رہنا ہے۔ اور جیب ٹیپ بند عرض کیا کہ ذرا مکان دلوائیے ڈھونڈ کر، تو ایک دم رخِ روشن کی تمام

روشنی غائب ہوگئی۔ دیر تک آسمان کی طرف دیکھتے رہے۔ گویا ہمارے لئے عالم بالا
میں مکان تلاش ہو رہا ہے ٹیبل بجاتے رہے گویا اپنے کتے سے مکان کا پتہ پوچھیں
گے۔ سر پہ ہاتھ پھیرا۔ کچھ منہ ٹیڑھا کیا۔ ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس لے کر بڑے مفکرانہ
انداز سے بولے۔ "مکان" ؟

عرض کیا: "جی ہاں مکان، یہی جو مکان ہوتا ہے نا۔ رہنے سہنے کے لئے،
یعنی کرایہ کا مکان، یہی پچاس ساٹھ کے کرایہ کا ہو۔"

اسی عالم جذب میں فرمایا۔ "وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر میں یہ سوچ رہا ہوں۔ کہ
مکان تو آج کل بڑا پرابلم ہے۔ بہر حال۔"

بیتابی سے عرض کیا: "کیا بہر حال" ؟

ارشاد ہوا: "مطلب یہ کہ غور کروں گا۔"

حیرت سے گذارش کی: "غور کس بات پر کروگے۔ یعنی یہ کہ مجھے مکان دلوانا
چاہیئے یا نہیں۔ کان کھول کر سن لو کہ مجھے مکان فوراً چاہیئے۔"

سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد فرمایا: "بڑا پرابلم ہے صاحب بڑا پرابلم۔
بہر حال اور لوگوں سے بھی کہہ رکھو اور میں ابھی کوشش کرتا ہوں۔"

ان حضرت کے وعدے میں ہم کو دعدہ کم اور اخلاق زیادہ نظر آرہا تھا۔
لہٰذا ہم نے واقعی دوسرے لوگوں سے بھی کہنے کی ایمانداری کے ساتھ نیت کرلی۔
مگر مصیبت یہ تھی کہ پہلے لوگ ڈھونڈھے جائیں۔ پھر اُن سے کہیں کہ مکان
ڈھونڈھو، مگر وہ جو مثل مشہور ہے کہ "جوئندہ یابندہ" ایک تو ملے ہوٹل کے گاڈ،
یہ گرل گائڈ قسم کے نہایت مستعد اور ہمدرد سے آدمی ہیں خصوصاً ہمارے ساتھ

تو اسٹیشن پر اس اخلاق سے پیش آئے تھے۔ کہ ان کا بس چلتا تو قلی کے بجائے خود ہی اسباب اٹھا لیتے۔ جب سے بچارے برابر خیریت پوچھ لیا کرتے تھے۔ اور مدارات لاکھ کا برابر تقاضہ فرمایا کرتے تھے۔ آخر ہم نے اُن سے عرض کر دیا۔ کہ "بھائی صاحب سب سے بڑا کام تو یہ ہے کہ مکان دلوا دیجئے کوئی"۔

پہلے تو وہ منہ کھول کر اس طرح رہ گئے گویا اس وقت ہم کو آنکھوں کے بجائے منہ سے گھور رہے ہیں۔ پھر بڑے تعجب سے بولے۔ "مکان یعنی مکان آخر کیوں"؟

ہم نے اپنا مفہوم واضح کرتے ہوئے کہا "بھئی رہنا ہے۔ تو اس لئے مکان چاہیئے ہے ہم کو"۔

کچھ ڈرے ہوئے انداز سے فرمایا۔ "آخر آپ کو ہوٹل سے کیا شکایت ہے"۔

ہم نے سمجھ کر بڑے زور سے کہا "او ہو! آپ غلط سمجھے۔ ہوٹل کی بات نہیں ہے۔ مجھے اب مستقل طور پر لاہور میں رہنا ہے۔ بال بچوں کو بلانا ہے۔ اس لئے کرایہ کا مکان چاہتا ہوں"۔

گائڈ صاحب نے اب پھر سے اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے کہا۔ "ہوں۔ ہوں تو گویا مکان۔ مگر صاحب مکان ہے ۔

ہمارے دل نے باقی جملہ پورا کر دیا۔ "بڑا پرابلم"۔

گائڈ صاحب کہہ رہے تھے۔ "مگر خیر یہ جلدی کا کام نہیں ہے۔ فی الحال آپ ہوٹل ہی میں رہیئے۔ میں برابر مکان کی فکر رکھوں گا"۔

ظاہر ہے کہ ان حضرت نے محض اپنے ہوٹل کی وجہ سے یہ بات ٹالی تھی۔ ان کو ہمارے مکان سے زیادہ ہوٹل کی فکر ہونا چاہیئے۔ ان سے ہمارا الگ

ہی غلط تھا۔ مگر اہل غرض اندھے تو ہوتے ہی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ بیوقوف بھی ہوتے
ہیں بعض بلیغ فرماتے ہیں خیر یہی غنیمت ہے کہ اس حماقت کا اس قدر جلد احساس
ہوگیا۔ چنانچہ اب کی مرتبہ ہم نے سمجھ بوجھ کر ایک ایسے شخص سے مکان کے متعلق
کہا جس کے انتخاب پر خود ہم کو ناز ہے چشمہ لگا کر آنکھ کی کمزوری کا اعلان کرنے
کے معنی یہ نہیں ہیں۔ کہ نظر انتخاب بھی کمزور ہے۔ ہوا یہ کہ گھر سے جوابی تار آیا تھا۔
اسی ہوٹل کے پتہ پر کہ فوراً خیریت لکھو۔ طریقہ یہ ہے کہ تار والے کو کچھ نہ کچھ اس
بات کا انعام دیا جاتا ہے۔ کہ وہ کسی کے مرنے کا تار نہیں لایا چنانچہ ہم نے
بھی عزیزوں کی اس وضع کو قائم رکھا۔ تار والا تھا شریف آدمی نہایت اخلاق
سے "اس کی کیا ضرورت ہے صاحب جی" کہہ کر ہاتھ پھیلا دیا۔ ہم نے غیر ارادی
طور پر کہہ دیا "یہ تو خیر یونہی ہے۔ البتہ اگر مکان دلوا دو کہیں سے ہم کو تو البتہ
انعام دیں گے۔ اس نے چشمہ کی اوٹ سے ہم کو اس طرح دیکھا گویا ہمارے متعلق
یہ غور کر رہا ہے۔ کہ اس شخص کے متعلق مکان میں رہنا ٹھیک کہا جا سکتا ہے۔
یا پنجرہ میں رہنا اور تفصیلی طور پر غور کرنے کے بعد تار کی زبان میں ارشاد فرمایا
"مکان! اچھا جی" تار کی عبارت غیر متعلق لوگ ذرا کم سمجھتے ہیں۔ مگر ہم جو
اہل معاملہ فوراً سمجھ گئے۔ کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ وہ بیچارہ سلام کر کے رخصت
ہوا۔ اور ہم پھر ان لوگوں کی تلاش میں نکل گئے جن کے متعلق مکان کی تلاش کے
سلسلہ میں ذرا بھی شبہ ہو سکتا تھا تفصیلات سے نہ آپ کو دلچسپی ہوگی۔ میں اتنی
بھی باتیں بنانے کا شوقین ہوں۔ البتہ اتنا بتائے دیتا ہوں۔ کہ ایک لسی والے
سے مکان کے لئے کہا اور محض یہ کہنے کے لئے لسی کا ایک گلاس پینا پڑا۔ ایک

ہیر کٹنگ سیلون میں تفصیلات سے مکان کی اپیل کرنے کے لئے بال منواتے ایک
ٹانگہ والے کے چہرے پر "ٹو لیٹ" کا سائن بورڈ نظر آیا۔ لہٰذا ایک گھنٹہ کا کرایہ
اس کو دے دیا۔ ایک دن۔ دو دن تین دن یہاں تک کہ اسی جستجو میں صبح ہونے
لگی۔ اور شام ہونے لگی۔ مگر مکان نہ آج ملتا ہے نہ کل۔ تب ملازمت اچھی خاصی ملازمت
کو چھوڑ کر جانے کی ٹھانی۔ اپنے آقائے نامدار سے بھی مکان کی مشکل کے
مقابلہ میں ملازمت سے دستبرداری کے آسان ہونے کا اظہار کر دیا۔ مگر اس
سلسلہ میں اس کثرت سے "پرابلم" کا لفظ سنا ہے کہ اب تو یہ شبہ ہونے لگا ہے
کہ کہیں پنجابی زبان میں انگریزی کے اس لفظ کے معنی مکان ہی کے تو نہیں ہیں۔
جستجو پر ایک وقت وہ بھی گذرتا ہے۔ جب جستجو کرنے والا تھک کر بیٹھ رہے
اور منزل خود اسے ڈھونڈھنے نکلے۔ چنانچہ ہم اس کمال کو بھی آخر پہونچ ہی گئے۔
گھر خط لکھ دیا کہ نوکری مل گئی ہے۔ مگر تم سب کو چھوڑنا پڑے گا۔ اس لئے کہ
مکان نہیں ملتا۔ ارادہ کر لیا کہ کسی ہوٹل ہی کو اپنا یتیم خانہ بنائیں گے۔ ایک ہوٹل
سے بات چیت بھی کر لی۔ اب خدا کی دین ملاحظہ ہو کہ مکان ملنا شروع ہو گئے۔
سب سے پہلے گائڈ صاحب نے ایک مکان کا مژدہ سنایا۔ ہم نے بے اختیار ان
کو کلیجہ سے لگاتے ہوئے عرض کیا کہ "یوں نہیں جناب پہلے آپ یہ کیجئے کہ کل
صبح چائے میرے ساتھ نوش فرمائیے۔ اس کے بعد ہم دونوں چلیں گے مکان
دیکھنے" وہ فرشتۂ رحمت تو تھے ہی۔ ہماری محبت کو بھلا کیسے ٹھکراتے وعدہ
کر کے چلے گئے۔ لاہور آنے کے بعد آج پہلی مرتبہ محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اس پردیس
نے اتنے دنوں کے بعد ہمارا انسان ہونا تسلیم کیا ہے۔ سر سے ایک بار اتر چکا

تھا پہلے مکان کے متعلق سوچا کرتے تھے۔ اب اس کی آرائش کے پرلطف خواب دیکھنے لگے۔ ایک کمرہ بنائیں گے، اسٹڈی کا۔ اس میں لکھنے کی میز پر کوئی فضول سامان نہ ہوگا۔ البتہ ایک بڑا سا شیشہ ضرور ہوگا۔ سونے کا کمرہ ذرا ارمان انگیز ہونا چاہیئے۔ کہ آدمی جاگے تو بھی خواب سا دیکھتا رہے یا خواب دیکھے۔ تو قبر وغیرہ کے نہیں بلکہ ذرا اچھے قسم کے۔ اسی طرح ہر کمرہ کا ایک تصور آنکھوں کے سامنے تھا دل تو خوش تھا ہی طے کیا کہ چلو آج پکچر میں چلیں شاید ڈرائنگ روم کا کوئی نیا سیٹنگ روم کا کوئی نیا سٹیگ نظر آجائے۔ کپڑے پہن پہن کر گنگنانے لگے۔

اک بنگلہ بنے نیارا

ہوٹل سے برآمد ہوتے ہی وہی تانگہ والا لپک کر سامنے آگیا "واہ بابوجی ایک مکان آپ کے لئے ڈھونڈھا ہے۔ تو اب آپ نہیں چلتے۔ کل کسی وقت دیکھ لیجیئے۔"

ہم نے سوچا کہ دیکھیں مکان یا نہ دیکھیں، لگاؤ صاحب کو اگر خبر ہو گئی کہ یہ اعتبار کے ساتھ مکان دیکھنے گیا تھا۔ تو برا نہ مان جائیں۔ مگر اس بیچارے نے بھی محبت ہی سے ہمارا خیال رکھا ہے۔ لہذا کیا مضائقہ ہے اگر ہم چپکے سے مکان دیکھ آئیں۔ کچھ غور کرنے کے بعد کہا "کل نہیں اس وقت چلو تو چل سکتے ہیں کل ہم کو اور مکانات دیکھنا ہیں" دل غنی ہو تو مکان کو آدمی مکانات کہنے لگتا ہے۔ یہ قواعد واحد جمع کی غلطی نہیں جذبات کی گرامر ناشناسی ہے۔ تانگہ والا تیار ہو گیا۔ اور ہم اس کے تانگہ پر روانہ ہوئے۔ چلا چل، چلا چل۔ شہر کے تمام محلے ایک ایک کر کے رخصت ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ لاہور کی تمام

آبادیاں ختم ہو گئیں۔ مگر ہمارے مجوزہ دولت خانے کا کہیں پتہ نہیں۔ تانگہ ہے کہ چل رہا ہے۔ اور ہم ہیں کہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ اس سے پوچھیں تو سہی کہ آخر ارادہ کیا ہے۔ مگر پھر خود ہی اپنے اس ارادے پر شرما کر رہ گئے کہ اس بیچارے نے تو ہماری محبت میں اتنی دور تک خاک چھان کر ہمارے لئے مکان ڈھونڈھا ہے اور ہم اس کے جذبہ کی یہ قدر کر رہے ہیں کہ ذرا سے فاصلہ ہی کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ غالباً اس غریب کو "پرابلم" کہنا نہ آتا تھا۔ لہذا وہ بخط مستقیم چلا جا رہا تھا۔ لاہور میں اس کو مکان نہ مل سکا۔ تو اس نے کسی اور شہر میں سہی بہر حال مکان ڈھونڈھ دیا۔ آخر خدا خدا کر کے اب اُس نے سڑکوں کو چھوڑ کر گلیاں دریافت کیں۔ ایک گلی سے دوسری میں۔ دوسری سے تیسری میں اور تیسری سے چوتھی جا کر ایک جگہ تانگہ روک کر کہا "یہ ہے سامنے والا مکان"۔

ہم نے چاروں طرف حیرت سے دیکھ کر پوچھا "کونسا مکان"؟

اطمینان سے کہنے لگا "وہ جو ٹاٹ کا پردہ سامنے پڑا ہے نا بس اسی کے اندر ایک طرف کو مکان ہے۔

ہم نے اس ٹاٹ کے پردے کو دیکھا جو ایک آستانے پر اس طرح پڑا ہوا تھا۔ گویا جہاز ڈوب چکا ہے۔ صرف اس کا پھریرا باقی رہ گیا ہے۔ ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ اور ہم یہاں پیرا کی سے قطعاً ناواقف۔ مرتے کیا نہ کرتے۔ دیوار سے چپکے ہوئے اس ٹاٹ کے پردے تک پہنچے اور اندر جھانک کر دیکھا تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مالکہ مکان ایک بڑی بی اپنی بکری سے کان میں کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ تاکہ ان کی مرغیاں نہ سننے پائیں۔ ہم کو دیکھتے ہی اندر بلا لیا۔ اور مکان دیکھنے

کی غرض معلوم کرنے کے بعد بولیں "یہی ہے بیٹا مکان دیکھ لو۔ میرا کیا ہے، میں ایک کونے میں پڑی رہوں گی۔"

وہاں سے جو بھاگے ہیں تو ہوٹل کے پاس پہنچ کر اس وقت ہوش بجا ہوئے جب تانگہ والے کو ساڑھے تین روپے مکان کی رونمائی کے سلسلے میں دینا پڑے۔ مگر اطمینان تھا کہ یہ مکان تو تفریحاً دیکھا ہے۔ اصل میں تو صبح دیکھیں گے۔ مکان گائڈ صاحب کے ساتھ۔

صبح گائڈ صاحب نے چائے پی کر جب الم کلف الخدمت کو رہین منت فرمالیا۔ تو مکان دکھانے چلے۔ یہ مکان یقیناً کسی زمانہ میں مکان تھا۔ غالباً نادر شاہ کے زمانہ میں اس کی پہلی مرتبہ مرمت ہوئی تھی۔ آسانی صرف یہ تھی کہ اس مکان میں رہ کر انسان اپنی اس نخوت کو بھول سکتا تھا جو بلا وجہ اشرف المخلوقات سمجھ سمجھ کر اپنے اوپر طاری رکھتا ہے۔ گائڈ صاحب نے تمام کے ساتھ "تھانوی" دیکھ کر غالباً یہ سمجھ لیا تھا کہ ان حضرت کو اصطبل درکار ہے۔ آفتاب کی روشنی سے آنکھوں کو جو تکلیف ہوتی ہے اس کے پورے بچاؤ کا انتظام تھا۔ ہوا لگ جانے سے جو بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں ان کا بھی کوئی خطرہ نہ تھا۔ ہر کمرہ غسل خانہ اور ہر غسل خانہ آسانی سے کمرہ بن سکتا تھا۔ نمی اس قدر تھی کہ خس کی ٹٹیوں کا خرچ آسانی سے بچایا جا سکتا تھا۔ ہر کمرے کا فرش ایسا کہ چاہے کھیتی باڑی شروع کر دیجئے چاہے پھلواری چمن بنا لیجئے مختصر یہ کہ ہم نے مکان دیکھنے کے بعد گائڈ صاحب کا منہ جو دیکھا تو دونوں میں ذرا بھی فرق نہ تھا سوہ بھی عجیب آثار قدیمہ بنے ہوئے کھڑے تھے سطرہ یہ کہ ہم کو اپنی

طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

"کیا رائے ہے"؟

ہم نے کہا: "مکان کے متعلق تو بعد میں عرض کروں گا پہلے تو مجھے یہ دریافت کرنا ہے کہ آپ کی کیا رائے ہے میرے متعلق"

صاف گوئی تو دیکھئے لگے کہنے "آپ اچھے رہیں گے اس میں"

ہم اپنے کو سنبھالتے ہوئے اس مکان سے نکل آئے۔ اور اس کے بعد سے گائڈ صاحب کی صورت سے وہ نفرت ہوئی ہے۔ کہ اگر مکان فوراً مل جاتا تو عدم تشدد پر زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتے تھے جیل میں رہنے کا انتظام ہو ہی جاتا۔ مگر شکر ہے کہ سب سے پہلے دوست نے آخر ایک جگہ تلاش کردی۔ اور ہم سے دوستی کے نام پر اپیل کی کہ ہم اس جگہ کو مکان سمجھیں۔ اس میں کمرے بھی ہیں۔ دروازے بھی۔ چھت بھی ہے اور غسل خانے بھی۔ کوٹھریاں بھی ہیں اور باورچیخانے بھی، مگر معلوم نہیں کیا بات ہے کہ بحیثیت مجموعی اس کو مکان نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ کہئے تو "پرابلم" کہہ دیا کریں۔

اب سنئے دیگر پرابلوں کی ریل پیل۔

"مکان تو مل گیا ہے اب ملازم دلوائیے۔"

"جی کیا کہا، ملازم؟ ملازم تو بڑا پرابلم ہے۔"

"مکان اور نوکر تو آپ کی دعا سے مل گئے ہیں۔ البتہ ضرورت کی بعض چیزیں نہیں ملتیں۔ مثلاً گھی۔"

"گھی۔۔۔! گھی تو بڑا پرابلم ہے۔"

"اچھا صاحب ڈالڈا ہی سہی، ہم بناسپتی آدمی بن کر رہ لیں گے۔ مگر شکر؟"

"شکر۔ یعنی چینی چاہیئے ہے آپ کو۔ اصاحب چینی تو بڑا پرابلم ہے۔"

ہم نے کہا "اسلام علیکم۔ چینی کے لئے میں نے کارڈ حاصل کر لئے ہیں۔

البتہ کوئلہ یا لکڑی کہیں سے دلوایئے۔"

"خدا جانتا ہے اسی فکر میں ابھی نکلا ہوں۔ یہ ایندھن کا معاملہ بڑا پرابلم

ہے۔"

مختصر یہ کہ لاحول ولا قوۃ جو چیز ہے پرابلم۔ جو بات ہے پرابلم، تعلیم اسی پرابلم کے نہ یاد ہونے کی وجہ سے چھوڑی اب لاہور بھی یہ پرابلم چھوڑ دلائے گا۔ مصیبت تو اس پرابلم کمبخت میں یہ ہے کہ حل ہو جائے تو پرابلم نہ حل ہو تو پرابلم پہلے تو صبر کر لیا تھا۔ کہ شاید صرف مکان کو پنجابی میں پرابلم کہتے ہیں۔ مگر اب تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ پنجاب ہی کو پرابلم کہنا پڑے گا۔ جہاں ان پرابلموں کے مارے ہم خود ہی حل ہوئے جاتے ہیں۔

پٹرول

آج کل پٹرول نہ ملنے کی وجہ سے کوٹھیوں کے موٹر خانوں میں موٹر جس ادا کے ساتھ کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں نا، لبس بالکل وہی حال جج صاحب کا تھا۔ کہ گویا آپ بھی پٹرول کے سہارے اب تک چل رہے تھے۔ اور اب بالکل ٹھپ ہو کر رہ گئے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ موٹروں میں آخر گیس پلانٹ لگ رہا ہے۔ تاکہ تیل سے نہ سہی مگر کوئلے سے ہی وہ چل تو سکیں۔ مگر جج صاحب کو چلانے کے لئے اب تک کوئی گیس پلانٹ بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ محض ایک پٹرول کی قلت نے جج صاحب کے تمام کام بند کر رکھے تھے۔ اور رہی بات کا ان کے پاس بس ایک

یہی جواب تھا کہ "کیا کروں آخر پٹرول ہی نہیں ملتا۔"

بیگم صاحبہ بے چاری ٹھہریں گھر کی بیٹھنے والی وہ کیا جانیں کہ پٹرول کیا اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس کے نہ ملنے سے دنیا کیوں کر مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ ان کو تو بس لے دے کر یہی ایک فکر تھی کہ جوان جہان سیانی لڑکی آخر کب تک گھٹنے سے لگی بیٹھی رہے گی۔ خدا برے وقت سے بچائے جوان لڑکی کو بھلا رکھنا کس نے بتایا ہے۔ میاں سے ہزار مرتبہ کہا کہ کہیں اس کی فکر کرو، آئے گئے تک نام دھرتے ہیں۔ اس کی ہمجولیوں کی گودیں تک بھر چکیں ریحانہ تو اس سے ایک سال چھوٹی ہے ایک لڑکا ہو چکا ہے۔ دوسرا بچہ آج ہی کل میں ہونے والا ہے۔ اور واقعی بیگم صاحبہ کا خیال درست تھا۔ نجمہ کی ہمجولیوں میں سے دو تو شادی کے بعد بیوہ تک ہو چکی تھیں۔ ایک کی شادی ہوئی۔ سال بھر بعد بچہ ہوا، اور اسی سلسلہ میں انتقال بھی ہو گیا۔ ایک کے میاں سے جرمنی میں آج کل طلاق کا مقدمہ چل رہا ہے۔ ایک آدھ ایسی ہیں کہ عام قسم کی ڈھنڈاپے کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ مگر نجمہ کا ابھی کہیں ٹھیک ٹھور ہی نہیں۔ آخر ایک دن انھوں نے طے کر لیا کہ آج جج صاحب سے کچھ نہ کچھ طے کرا کے رہیں گے۔ تفصیل سے گفتگو کرنے کے ارادے سے پاندان کے ڈھکنے میں کافی ڈلی اور سروتہ لے کر جج صاحب کے کمرے میں پہنچیں۔ جو پٹرول نہ ملنے کی وجہ سے غم غلط کرنے کے لئے اخبار پڑھ رہے تھے۔ بیگم صاحبہ کو اس طرح ڈلی سروتے سے مسلح دیکھ کر انھوں نے بھی مدافعت کے لئے حقہ کی نے کو منہ میں لگا لیا۔ مگر توبہ کیجئے بیگم صاحبہ بھلا ان دھمکیوں میں کب آنے والی تھیں۔ ایک دفعہ بیٹھ ہی تو گئیں۔ جان پر کھیل کر اور کھٹ کھٹ ڈلی اور سروتے کا

شغل شروع کرنے کے بعد بولیں۔

میں پوچھتی ہوں کہ آخر بچہ کو کب تک بٹھائے رکھو گے۔ ماشاء اللہ سولہواں ختم ہو کے خالی کے چاند سے سترھواں برس شروع ہوا ہے۔ اور تم ہو کہ اب تک اس کو دودھ پیتی بچی ہی سمجھ رہے ہو۔"

جج صاحب نے پہلے تو چشمے کی آڑ سے بیوی پر ایک تنقیدی نظر ڈالی۔ پھر کچھ سوچا۔ غالباً یہ سوچا ہوگا کہ اس قسم کی عورتیں پٹرول نہ ملنے کی حالت میں ملک و قوم کے لیے کس حد تک مفید یا مضر ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ ابھی کسی نتیجے پر پہنچنے بھی نہ پائے تھے۔ کہ بیگم صاحبہ نے پھر ان کو چونکا دیا۔

پھر تم نے چپ سادھ لی۔ میں کہتی ہوں کہ آخر کب تک ٹالتے رہو گے تم نے تو سچ مچ زندگی عذاب کر رکھی ہے۔ آخر میں کس کس کی زبان بند کروں اور کس کس سے کہوں کہ لڑکی کے باوا سے پوچھو جن کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اور جو بیٹی کو ابھی تک نا سمجھ سمجھتے ہیں۔"

اب جج صاحب نے بھی جوابی حملہ کے لیے گلا صاف کیا۔ اور نہایت تشویش کے ساتھ بولے "تم تو یہ سمجھتی ہو کہ گویا میں آدمی تھوڑی ہوں۔ ایک تو وہ ہوں۔ گویا مجھ کو نہ کسی بات کی فکر ہے نہ کچھ۔ لڑکی شادی کے قابل ہو چکی، یہ اطلاع بھی بس تم ہی کو ہے۔ شادی کی فکر بھی ہے تو بس تم ہی کو میں نہ لڑکی کا باپ ہوں۔ نہ مجھ میں گویا وہ کیا کہتے ہیں۔ اسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہے۔ ہر وقت ان ہی تمام فکروں میں مبتلا ہوں۔ یہ حال ہو کر رہ گیا ہے۔ میرا کہ صبح جو ناشتہ کیا تھا وہ جوں کا توں رکھا ہوا ہے۔ اب بتاؤ کھانا کس وقت کھاؤں گا۔"

بیگم صاحبہ لاکھ کچھ سہی، مگر پھر بھی بیوی تھیں پچیس برس سے جج صاحب کی بیوی تھیں۔ اتنے دنوں کے پالے ہوئے جانور تک سے خصوصیت ہو جاتی ہے وہ تو پھر بھی میاں تھے۔ مجازی خدا، آخر دھیمی پڑ گئیں اور سمجھا کر کہا: "تو پھر آخر نسیم آپا کے لڑکے میں کیا خرابی ہے۔ پڑھا لکھا صورت شکل میں بھی اچھا۔ کسی بری بات میں نہیں۔ وہ جو عورت کا قصہ تھا۔ اب تو سنا ہے۔ کہ وہ بھی چھوٹ گئی۔ پھر یہ کہ جوانی میں کون ایسی باتیں نہیں کرتا۔ تم اپنی ہی کہو۔ وہ کون تھی تمہاری۔ کیا نام تھا اس کا، دیکھو۔ اے کچھ بھلا سا نام تھا نگوڑی کا۔"

جج صاحب نے جلدی سے کہا: "خیر۔ خیر۔ مطلب یہ کہ لڑکوں کی تو کوئی کمی نہیں، تمہاری نسیم آپا کا لڑکا ایک، جمال دو، سراج تین، اور خدا تمہارا بھلا کرے۔ ایوب چار اور......اور......"!

بیگم صاحبہ نے الجھ کر کہا: "توبہ ہے اب تم سے فہرست کون پوچھ رہا ہے میں تو یہ کہتی ہوں کہ کہیں بات ٹھیک تو کرو۔"

جج صاحب نے کہا: "بھئی کس برتے پر بات ٹھیک کروں حال تو یہ ہے کہ پٹرول تک نہیں ملتا۔"

بیگم صاحبہ نے حیرت سے آنکھیں نکال کر کہا: "پٹرول نہیں ملتا"؟

جج صاحب نے یقین دلاتے ہوئے کہا: "ملتا ہوتا تو پھر کیا تھا۔ حال تو یہ ہے کہ کسی قیمت پر مقررہ مقدار سے زیادہ پٹرول نہیں ملتا۔"

بیگم نے بدستور تعجب سے کہا: "نہیں میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ پٹرول تو خیر نہیں ملتا، وہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ مگر یہاں تو ذکر نجمہ کی شادی کا تھا۔ پٹرول

موئے کا دکھڑا کیوں لے کر بیٹھ گئے۔

جج صاحب نے اپنی بیوی کو نہایت عورت سمجھتے ہوئے کہا:۔ یعنی کمال کرتی ہو بلکہ گویا جو بات کہتی ہو دنیا سے نرالی کہتی ہو یہ پٹرول کا دکھڑا ہوا۔ ارے صاحب حال تو یہ ہے۔ کہ پانچ دن سے سخت نزلہ ہے۔ مگر پٹرول کے نہ ہونے سے مجبور رہوں۔ میرن صاحب کی لڑکی کا کل صبح انتقال ہوا۔ مگر میں پٹرول کے نہ ہونے سے کفِ افسوس مل کر رہ گیا۔ ذرا میرا حلیہ ملاحظہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ افریقہ کے کسی جنگل سے پکڑ کر لایا گیا ہوں۔ زندگی بھر تم نے اتنے بال بڑھے ہوئے اور سر پر یہ جنگل نہ دیکھا ہوگا۔ مگر مجبور ہوں کیا کروں، پٹرول ہی نہیں ملتا۔ صبح کا ناشتہ یوں ہی رکھا ہے۔ گویا سینہ پر۔ کھانے کا وقت آگیا اور بھوک غالب ہے مگر میں کر ہی کیا سکتا ہوں جب پٹرول نہ ملے۔"

بیگم صاحبہ نے اپنے شوہر کو نہایت تشویش کے ساتھ دیکھنا شروع کیا۔ اور تشویش کی بات بھی تھی۔ اس لئے کہ جوانی سے زیادہ بڑھاپے میں سہاگ عزیز ہو جایا کرتا ہے۔ آخر انھوں نے رکتے رکتے بہت ہی سہمے ہوئے انداز سے کہا۔ "نزلہ، میرن صاحب کی لڑکی کا انتقال، سر کے بڑھے ہوئے بال۔ آخر تم کہہ کیا رہے ہو۔"

جج صاحب کو غالباً اپنی بڑی بی کے بھولے پن پر باوجود پٹرول نہ ملنے کے کچھ پیار سا آنے لگا۔ وہ جوانی میں بھی ایسی ہی الھڑ تھیں۔ اور اسی معصومیت کی وجہ سے جج صاحب نے تین رشتہ دار لڑکیوں میں سے اپنے لئے ان کا انتخاب کیا تھا۔ اور وہ اس سلسلہ میں صرف بیگم صاحبہ ہی کو نور جہاں نہیں

سمجھتے تھے۔ بلکہ اپنے کو بھی جہانگیر سمجھا کرتے تھے۔ اس وقت جج صاحب کی آنکھوں کے سامنے بیگم کا وہی عہد شباب آگیا۔ اور ان کو بیگم کے جھریوں دار چہرہ پر وہی دلربا معصومیت کھیلتی ہوئی نظر آنے لگی۔ چنانچہ مسکرا کر پیار سے بولے "اس قدر بھولی ہو تم اب تک کہ میں کیا کہوں۔ ارے بھئی میرا مطلب یہ ہے۔ کہ پٹرول کے نہ ہونے سے میں تو گویا اپاہج ہو کر رہ گیا ہوں۔ پٹرول ہوتا تو ڈاکٹر کے پاس جا کر نزلے کی دوا لاتا۔ پٹرول ہوتا تو کیا بات تھی۔ میرن صاحب سے زندگی بھر کے تعلقات تھے اس مصیبت میں جا کر ان سے ہمدردی کرتا تجہیز و تکفین میں بھی شریک ہو جاتا۔ پٹرول ہی کے نہ ہونے کی وجہ سے ہیر کٹنگ سیلون تک نہیں جا سکتا کہ بال ہی بنوالوں۔ مختصر یہ کہ ...."

بیگم نے اس تمام تذکرے کو انتہائی مہمل سمجھ کر کہا "توبہ ہے اب یہ لنگیبر سوئی ختم بھی ہو گی۔ پٹرول مولا ملے یا نہ ملے مگر کیا تم یہ چاہتے ہو کہ پٹرول نہ ملے تو لڑکی کو بٹھا رکھا جائے۔"

جج صاحب نے قطعی طور پر کہا "بہرحال جو کچھ بھی خدا کو منظور ہے وہ ہو گا مگر یہ تو ہونے سے رہا کہ بغیر پٹرول کے میں اٹھا کر لڑکی کی شادی کر دوں۔"

بیگم نے جل کر کہا "خدا کے لئے مجھ کمبخت کو سمجھا تو دو کہ کونسی شرعی ممانعت ہے کہ اگر پٹرول مولا نہ ملے تو اولاد کی شادی نہ کرو۔"

جج صاحب نے حیرت سے کہا "بھئی یہ کیسی باتیں کر رہی ہو۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میری لڑکی کی شادی۔ یکوں، تانگوں اور بیل گاڑیوں پر ہو جائے۔ بغیر پٹرول کے آخر برات میرے دروازے تک کیوں کر آئے گی۔ بغیر پٹرول کے دلہن رخصت

ہو کر کیوں کر جائے گی بغیر موٹر کے شادی کے انتظامات کس طرح ہوں گے۔ بولے
بھئی بتاؤ نا مجھے کہ جب پٹرول ہی نہ ملے تو آخر میں کیا کروں"۔

بیگم نے قائل کرنے کے لیے تاریخی حوالہ ڈھونڈ کر کہا "جب یہ موا پٹرول نہ
تھا۔ اور یہ نگوڑے موٹر نہ چلتے تھے۔ تو کیا شادیاں نہیں ہوتی تھیں"۔

جج صاحب نے تاریخ میں ایم۔ اے کیا تھا۔ اور ان کا ایم اے ہونا بجائے
خود ایک تاریخی واقعہ تھا۔ لہذا وہ تاریخ کے معاملہ میں کسی سے دب کر نہیں رہ سکتے
تھے ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لئے آگے کھسکے اور ٹھوڑا سا اکڑ کر بولے"۔
جب موٹر نہ تھے۔ شادیاں تو اس وقت ضرور ہوتی تھیں۔ مگر اس سے بھی پہلے یہ
ہوتا تھا۔ کہ شادیاں بالکل ہی نہ ہوتی تھیں۔ البتہ انسان پیدا ہوتے رہتے تھے"۔

بیگم نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا "آگ لگے تمہاری باتوں کو یہ لڑکی کی
شادی کے متعلق بادلجان باتیں کر رہے ہیں۔ تم سے تو جو بات کرے وہ بھی
گنہگار بن کر رہ جائے"۔

بیگم نے ڈلی ڈھکنا اٹھایا۔ سروتہ سنبھالا اور خفا ہو کر چلی گئیں۔ جج
صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر گویا خود اپنے سے کہا "اگر پٹرول مل سکتا
تو یہ کیوں خفا ہوتیں۔ مگر کیا کروں پٹرول کمبخت ملتا ہی نہیں"۔

رضائی

جاڑے کا سفر سائیں سائیں کرنے والی رات میں شائیں شائیں کرنے والی ٹرین اور شریکِ سفر بھی کون۔؟

ع زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام.....

مگر نہیں، ٹھہریئے تو سہی۔ نام کا بھلا ہم کو کیا پتہ ہے؟ نام تو نام صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ البتہ اتنا معلوم تھا۔ کہ حسین ہے اور بے حد حسین۔ اس کی دلفریبی کی قسم بغیر دیکھے ہوئے اسی طرح کھا سکتے تھے۔ جس طرح بغیر خدا کو دیکھے ہوئے سچی تو سچی جھوٹی قسمیں بھی جب جی چاہے کھا سکتے ہیں۔ ارغوانی رضائی جس پر

کامدانی کے ستارے بکھرے ہوئے تھے۔ اس پیکرِ ناز کے حُسن کو چھپا چھپا کر چمکا رہی تھی۔ یہ رضائی لکھنؤ کی بنی ہوئی تھی۔ اس لئے کہ رضائی میں کامدانی بنانے کا سلیقہ اور سلیقہ سے زیادہ فرصت بھلا کسی شہر کو کہاں نصیب ہے؟ کاسنی گوٹ میں سلمے ستارے کا وہ کام جو دیکھنے والے کی نظروں کو جھپکائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قسمت ہو تو ایسی کہ مقابل والی سیٹ پر ہم کو بھی نہایت کشادہ جگہ مل گئی۔ صرف ایک مسافر کونے میں سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ جس کے پاس اوڑھنے کو کچھ نہ تھا۔ دھوتی کا پینچ کھول کر پیروں پر ڈال لیا تھا۔ تاکہ دل کو یہ سمجھا سکے کہ ہم بھی کچھ اوڑھے ہوئے ہیں۔ اس شخص کو بیٹھنا ہی چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ اگر لیٹ جاتا تو واقعی سردی لگ جاتی۔ سردی تو خیر اب بھی لگ رہی ہوگی۔ مگر جتنی لگنا چاہیئے۔ اتنی نہ لگ رہی ہوگی۔ بہرحال اس شخص کے متعلق غور کرنے کی فرصت ہی کسے تھی۔

ہولڈال کو کھول کر سیٹ پر اپنا قبضہ جمالیا۔ اور یہ غور کرنے لگے کہ آج کس کا منہ دیکھ کر اُٹھے تھے۔

(ذرا غور تو کیجیے ایک حسین عورت تن تنہا۔ اور پھر لمبا سفر۔ لمبے سفر کا اندازہ سونے کے انداز سے ہو رہا تھا۔ کیسی بے فکری کی نیند تھی۔ واقعی جوانی سو رہی تھی۔)

سچ مچ حُسن حفاظت کر رہا تھا۔ جی چاہتا تھا۔ کہ اس وقت کہیں سے ایک ستار مل جائے اور خوابِ ناز کے متعلق جتنی ٹھمریاں، دادرے یا غزلوں کے اشعار ہم کو یاد ہیں۔ سب گا کر رکھ دیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ رُوح گنگنا رہی ہے اور ہم جھوم رہے ہیں۔ یا ہم جھوم رہے ہیں اور ہم ہی گنگنا رہے ہیں۔ یا رُوح جھوم رہی ہے۔ اور ہم گنگنا رہے ہیں۔ بہرحال جھومنا اور گنگنانا تو بالکل یقینی

کا باپ۔ یہ بھی سمجھنے کی بات ہے۔ کہ اگر اس حسینہ کی خدانخواستہ شادی ہو چکی ہوتی تو ایسی حسین بیوی کو تنہا سفر کرنے کی اجازت مشکل ہی سے کوئی شوہر دے سکتا تھا۔ تو گویا اس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ مگر ایک مصیبت یہ بھی تو تھی۔ کہ ہماری شادی ہو چکی تھی۔ مگر سنیئے تو سہی اگر ہو بھی چکی تھی تو کیا۔؟ اول تو اس بیچاری کو اس کی خبر ہی کیوں کر ہو سکتی ہے۔ اور خبر ہو بھی تو دوسری شادی کوئی گناہ تو ہے نہیں۔ شفقت ماموں نے دوسری شادی کی تھی۔ پہلی بیوی میکے میں رہتی تھیں۔ اور دوسری بنگلہ میں، ان کو عدالت کی مقرر کی ہوئی رقم دی جاتی تھی۔ اور ان کو سب کچھ۔ اُن کے بچوں کے بھی یہی باپ تھے۔ اور اِن کے بچوں کے بھی...... مگر صاحب یہ دھوتی اوڑھنے والا۔ اور سردی میں سکڑنے والا مسافر بھی عجیب بے حس تھا۔ یعنی اس کو سونے اور سردی کھانے کے علاوہ گویا اس کی خبر ہی نہیں تھی۔ کہ عین اس کے سامنے ہی ایک فتنہ بیدار ہے۔ اور فتنہ گر محو خواب، حالانکہ از روئے قاعدہ اس بے بستر مسافر کو ہم سے زیادہ خوش نصیب ہونا چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ یہ پہلے ہی سے ان کا ہم سفر تھا۔ جن کے شریک سفر ہونے کی سعادت ہم کو اب حاصل ہوئی تھی۔ اور قرینہ یہ بتا رہا تھا۔ کہ یہی سفر ہمارا حاصل زندگی بن کر رہے گا۔ لیٹے لیٹے ایک دم سے خیال آیا۔ کہ یہ جو ہم سگریٹ پی رہے ہیں۔ اس کا درجہ بیڑی سے کچھ یونہی سا بلند ہے۔ اور سب سے بڑا نقص اس کمبخت سگریٹ میں یہ ہوتا ہے کہ ناظرین کو اس بات کا اندازہ کرایا ہی نہیں جا سکتا، کہ یہ سگریٹ ایک آنہ پیکٹ والا نہیں، بلکہ ڈھائی روپیہ ڈبے والا ہے۔ اس کی لے دے کر بس یہی ایک ترکیب ہے کہ سگریٹ لبوں میں دبا کر اس کا ڈبہ آدمی اپنے ہاتھ میں لئے رہے۔

تھا۔ البتہ تقسیم کار کا صحیح اندازہ اس وقت آسانی سے نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم نے
اسی عالم جذب و سکر میں اپنے ہولڈال کو بہت قرینہ سے سیٹ پر لگا دیا۔ قرینہ
سے مطلب یہ کہ ریشمی سوزنی جو پہلے سب سے نیچے رکھی ہوئی تھی۔ تاکہ سفر میں خراب
نہ ہو۔ سب سے اوپر بچھا دی تاکہ جب وہ اپنی دلفریب رضائی کا ایک گوشہ
اٹھا کر اپنے ہوشربا مکھڑے کو بے نقاب کریں۔ تو بستر کی کم حیثیتی سے ہمارے
متعلق کوئی ایسی رائے قائم نہ کرلیں۔ کہ ہم کو اس رائے میں تبدیل کرانے میں
خواہ مخواہ کچھ وقت صرف کرنا پڑے۔ پھول دار تکیہ اوپر اور سادہ نیچے رکھ لیا۔
ولایتی کمبل نکال کر سودیشی کمبل ہولڈال کی جیب میں رکھ دیا۔ ارادہ تھا کہ
بس یہی کپڑے پہنے ہوئے لیٹ جائیں گے۔ مگر اب یہ رائے تبدیل کردی۔
شب خوابی کے ریشمی سوٹ کی ضرورت نہایت شدت کے ساتھ محسوس ہوئی
ورنہ ظاہر ہے کہ وہ یہی کہتیں اپنے دل میں کہ عجیب جانگلو ہے۔ جس کے سونے
اور جاگنے کا ایک ہی لباس ہوتا ہے۔ ہائے اس وقت ڈریس گون نہ ہوا۔ وہ
اُونی نہ سہی ریشمی ہی سہی مگر کچھ تو بھارا دے ہی جاتا۔ بہر حال لیٹ گئے۔ رضائی کی
طرف ہمہ تن توجہ اور رضائی ہٹنے کے ہمہ تن منتظر۔

اس کا حسین ہونا تو خیر طے تھا۔ کاش حُسن کے ساتھ ہی ساتھ ناکتخدا بھی
ہو۔ تاکہ ...... مگر خیر یہ بات تو بہت قبل از وقت ہے معلوم نہیں اس کے
والدین اس کی نسبت کو منظور بھی کریں گے یا نہیں۔ لیکن ایک بات ہے۔ کہ والدین
کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ اس قدر آزاد خیال ہے۔ کہ
تنہا سفر کر رہی ہے۔ اور ناکتخدا بھی اس لئے ہے کہ نہ تو کوئی بچہ ہے اور نہ بچے

سگریٹ ایک سرے سے نہ پینا بھی اپنے کو بے وقوف ثابت کرانے کے برابر ہے۔
ظاہر ہے کہ وہ نہایت آسانی سے یہ سوچ سکتی تھیں۔ کہ جس شخص میں اب تک سگریٹ
پینے تک بلوغ نہ پیدا ہوا ہو اس میں ایک عورت کی پذیرائی کا شعور کیونکر ممکن ہے
یاد آیا کہ اٹیچی میں پائپ رکھا ہوا ہے۔ ایک دم اچھل پڑے۔ طبیعت باغ باغ ہو گئی
بلکہ ۔ ع " پسلی پھڑک اٹھی نگۂ انتخاب کی "

واقعی پائپ اس قسم کے مواقع کے لئے نہایت آزمودہ چیز ہے۔ پائپ پینے
والے کی طرف تو عورت اس طرح کشاں کشاں آتی ہے جس طرح ...... جس طرح ....
خیر ...... اس وقت کوئی تشبیہہ یاد نہیں آ رہی ہے۔ بہر حال عورت پائپ کی طرف
کھنچتی ضرور ہے۔ ہم نے بستر سے اٹھ کر فوراً اٹیچی میں سے پائپ نکالا۔ تمباکو کا ڈبہ
برآمد کیا۔ اور اپنے حسین فنکار کے لئے پائپ سے مسلح ہو کر پھر لیٹ گئے۔

معلوم نہیں اس قسم کے امتحانی مواقع پر سب کا دماغ اس قدر حاضر
ہو جاتا ہے۔ یا قدرت نے یہ خصوصیت ہم ہی کو عطا کی ہے۔ کہ بلا کی سوجھ بوجھ
ہو جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر فوراً پہنچ جاتی ہے۔ مثلاً اس وقت ہم کو یہ
خیال آیا۔ کہ ہم روشنی کے رخ پر لیٹے ہوئے نہیں ہیں۔ اور ہمارے چہرہ پر اندھیرا
ہے۔ اگر ہم اس رخ کو بدل دیں۔ یعنی تکئے اس طرف رکھ دیں جدھر فی الحال پائینتی
ہے۔ تو چہرے پر روشنی پڑنے لگے گی۔ اور دیکھنے والے کو رنگ نکھرا ہوا نظر
آئے گا۔ یاد رکھئے کہ بجلی کی روشنی رنگ کے نکھارنے کے لئے نہایت مجرب تسلیم کی
گئی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مانی ہوئی بات ہے۔ کہ یہ سانولا سلونا رنگ ہوتا
ہے نا۔ اس کو اگر اندھیرے میں رکھا جائے تو چہرے کا نمک کالا نمک نظر آتا ہے

اور بلا وجہ انسان کو سیاہ فام ہونے کی ندامت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ موقع اس قسم کی ندامت کا نہ تھا۔ ہم نے فوراً ہولڈال کا رخ بدل دیا۔ اور رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر دل ہی دل میں کہنے لگے کہ دیکھیں اب ادھر جاتا ہے پروانہ یا اِدھر آتا ہے۔

مگر صاحبِ قیامت کی جوان اور الھڑ، الھڑ اور جوان نیند تھی کہ کروٹ تک بدلنے کا ہوش نہ تھا۔ تزئین کی جنبشوں سے رضائی کے ریشم میں ہلکی ہلکی لہریں پیدا ہو رہی تھیں۔ اور ان لہروں کی وجہ سے کاملانی اور جگمگ جگمگ ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی لالہ زار میں کسی بہت بڑے سرمایہ دار جگنو کی برات آئی ہوئی ہے۔ یا بحیرۂ احمر میں ایک دم سے تمام ستارے غسل کرنے کے لئے اتر آئے ہیں۔ مختصر یہ کہ رضائی جاگ رہی تھی۔ اور رضائی والی تھی کہ کسی طرح جاگنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ اور یہاں دماغ تھا کہ اس کے جاگنے کے بعد پیش آنے والے واقعات کے تصوروں کا گویا میلہ لگائے ہوئے تھا۔ تقریبِ ملاقات کی بے شمار تجویزیں ذہن میں آ آ کر رد ہو رہی تھیں۔ تعارفی مکالمے کے رہرسل پر رہرسل دل ہی دل میں ہو رہے تھے۔ اپنے سوالات کے ساتھ ہی ساتھ ان کے جوابات بھی ذہنِ رسا خود ہی دے رہا تھا۔ کہ ہم ان سے کہیں گے۔

"معاف کیجئے گا غالباً دو بجے ہوں گے"۔

وہ۔ "جی ہاں شاید چار ابھی نہیں بجے۔"

ہم۔ "تو آپ بھی بھوپال تشریف لے جا رہی ہیں"؟

وہ۔ "جی ہاں! تو کیا آپ بھی بھوپال جا رہے ہیں۔؟"

ہم - "جی ہاں بھوپال، مجھ کو وہاں کی ایک ادبی انجمن کے سالانہ اجلاس کی ایک نشست کی صدارت کرنا ہے"

وہ - "جناب کا اسم مبارک -"

ہم - "مجھے کاشف الکلامی الہاپڑی کہتے ہیں - روزنامہ غروب کا مدیر اعلیٰ ہوں"

وہ - اوہ - اوہ - آپ ہی کاشف صاحب ہیں - میں نے تو آپ کا نام اکثر سنا ہے۔ آپ کی کتاب "شکور و نصیبن" میرے کتب خانہ میں موجود ہے - بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر -"

ہم - "جو الفاظ میرے جوف دماغ میں محدود تخیل تھے - وہ آپ نے ارشاد فرما دیئے - اب میں اپنے جذبہ مسرت کو معذور تکلم پاتا ہوں - اور زبان بے زبانی ہی کو ترجمانی کا ذریعہ بناتا ہوں"

وہ - "ماشاء اللہ صرف قلم ہی میں جادو نہیں بلکہ گفتگو میں بھی وہی تحریر والا سحر موجود ہے -"

"میں دریافت کرسکتا ہوں - کہ آپ کا ..... یعنی ..... اسم ....."

"جی میرا نام ناہید درخشاں ہے - میرے والد خان بہادر طغرل خاں کا نام آپ نے سنا ہوگا"

اچھا ..... اچھا ..... اور آپ کے ....

جی نہیں بس اور میرے کچھ نہیں - میں ابھی ......

رعنائی میں یکا یک جنبش ہوئی - اور یہاں ہمارا ہر سلسلہ ختم - بالوں پر ایک ہاتھ پھیر کر دل ہی دل میں کہا۔ ؎ آخر آمد زلپس پردۂ تقدیر پدید - مگر وہ

جنبش کا مدانی کے ستاروں کو جگمگا کر رہ گئی، ایک لہر سی آئی اور پھر سطح پر سکون طاری ہو گیا۔ مگر یہ اچھا ہی ہوا اس لئے کہ ایک نہایت شدید غلطی کا فوراً احساس ہم کو ہوا کہ ہم نے یہ کیا غضب کیا تھا۔ کہ سر پر ہاتھ پھیر کر بالوں کو درست کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ یہ بات ہم کو پہلے سے معلوم تھی کہ خواتین عام طور پر بنے سنورے بالوں کو پسند نہیں کرتیں۔ بلکہ وہ مرد کے بالوں میں ایک مستقل ژولیدگی دیکھنا چاہتی ہیں۔ روکھے روکھے سے بال تھوڑے سے الجھاؤ کے ساتھ اگر کسی مرد کے سر پر ہوں تو عورتیں اس کو آسانی کے ساتھ ادبی قسم کا آدمی سمجھ لیا کرتی ہیں۔ اور بنے ہوئے بالوں والے مرد کے متعلق تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کسی تھیٹر کا ایکٹر ہے یا کسی دفتر کا بابو۔ دوسرے یہ بھی دیکھا گیا ہے۔ کہ الجھے ہوئے نیم پریشان بالوں کے ساتھ پائپ بھی خوب سجتا ہے۔ اور اس سے آدمی کے مفکر ہونے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہم نے بالوں پر دو ہاتھ بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر پھیر کر اُن کو منتشر کر دیا۔ اور اس طرح دل پر سے یہ بوجھ اتر گیا۔ کہ اب کم سے کم خوبصورت بلا کے ہیرو تو نظر نہ آئیں گے۔ اور نہ حاکم پرگنہ کے اہلمد اور نہ کسی کے اہل خانہ۔

دماغ تو ان احتیاطوں میں مصروف تھا مگر دل کو رضائی والے سربستہ راز کی مستقل طور پر کھوج تھی ''تو کیا واقعی اس کا نام ناہید درخشاں ہو گا'' ؟ بہر حال ناہید درخشاں ہو گا'' ؟ بہر حال ناہید درخشاں نہ سہی طاؤس رقصاں سہی، مہ کنعان سہی، مگر یہ لگا یقیناً کوئی نہایت بے ادبی قسم کا کھنکھتا ہوا نام اور اس نام سے پہلے جب اس میں ''آنسہ'' لگا دیا جائے گا۔ تو واقعی

یہی معلوم ہوگا۔ کہ کامدانی پڑی ہوئی ارغوانی رضائی میں کامدار کاسنی گوٹ
لگا دی گئی ہے۔ اس قسم کی شریکِ زندگی ایک شوہر کو کس قدر بلند کرسکتی ہے اس
کا اندازہ ہر ایک نہیں کرسکتا حد یہ ہے کہ وہ شریکِ سفر دھوتی اوڑھنے اور
سردی کھانے والا مسافر بھی نہیں کرسکتا۔ جو جمال ہمنشین کی دولت سے مالا مال
ہونے کے باوجود محروم تھا۔ دراصل یہ لوگ آدمی تھوڑی ہوتے ہیں چوپائے
ہوتے ہیں۔ مگر اس وقت ہمارا مستقبل ہمارے پیش نظر تھا۔ چمکتا ہوا جگمگاتا
ہوا معطر۔ معطر لطیف لطیف حسین حسین۔ بات یہ ہے کہ زندگی کا بہت
بڑا حصہ اسی شرمندگی میں گذر گیا ہے۔ کہ کوئی تقریب ہو کوئی اجتماع ہو، کوئی
محفل ہو۔ ہم اپنی اہل خانہ کو ساتھ نہیں لے جاسکتے۔ سب اپنی اپنی بیویوں کو
چمکاتے ہوئے اور خود چمکتے ہوئے آتے ہیں۔ اور ہم "واحد حاضر" بنے
ہوئے ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ نہ ہوتی بیوی تو کوئی غم نہ تھا۔ مگر بیوی موجود اور
ہم تنہا۔ خلوت آباد۔ جلوت ویران۔ گھر میں عیال دار باہر رنڈوے۔ بات
یہ ہے کہ ڈرتے ہیں۔ کہ کہیں غلط ساری باندھ کر نہ پہنچ جائیں، کوئی بھونڈی
بات نہ کہدیں۔ سر کے بال گنواروں کی طرح کے نہ سمجھے لیے جائیں۔ ساری جمپر
جوتے اور موزے کے رنگوں کا توازن اور تناسب مضحکہ خیز نہ ہو جائے یہ تمام
اندیشے محض اس لئے ہیں۔ کہ بیگم صاحبہ کی تربیت بحیثیت ایک "بٹیا" کے
ہوئی ہے بحیثیت "مس بابا" کے نہیں ہوئی ہے ما سکول اور کالج میں
پڑھی ہوئی نہیں ہیں۔ ایسی بیوی کو کسی محفل میں لے جانا کسی وقت بھی خطرے
سے خالی نہیں۔ مگر...... اب انشاء اللہ العزیز یہ کمی پوری ہو جائے گی۔

اب ہم بھی سوسائٹی میں بیوی کا فردالا کوٹ اپنے کندھوں پر ڈال کر احباب سے سرخروئی کے ساتھ بات کر سکیں گے۔ اور اب ہماری مسز کے بھی نقرئی۔ طلائی اور گنگاجمنی قہقہے پارٹیوں کے سبزہ زاروں پر زمزمے برساتے اور رقص کرتے نظر آئیں گے۔ ہمارے منہ میں سگار ہے ہاتھ پتلون کی جیب میں اور ٹہل رہے ہیں۔ وہ ایک حسین تیتری کی طرح اِس صوفے سے اُس صوفہ پر اور اُس صوفے سے اس صوفہ پر اُڑتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ ہائے کیا زندگی ہوگی۔ سوچتے سوچتے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اور دل خود بخود گنگنانے لگا۔

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر ؏

یکایک رضائی میں پھر جنبش ہوئی۔ ستارے جھلملائے۔ نظریں بہکیں۔ ریشم کے چھوٹے سے سمندر میں ہلکا سا طوفان آیا۔ اور معلوم ہوا کہ ان کو کچھ زیادہ سردی لگ رہی ہے۔ اس لئے کہ پیر کچھ سکڑ گئے تھے۔ اور رضائی کے نیچے جسم کچھ سمٹا ہوا سا نظر آرہا تھا۔ دل نے فوراً ایک لاجواب تدبیر سمجھائی۔ دماغ نے تائید کی۔ اور ہم ایکا دم بستر سے نکل کر ٹرین کے فرش پر کھڑے ہوگئے۔ ولائتی کمبل اٹھا کر اس زرکار رضائی پر آہستہ سے ڈال دیا۔ دیکھئے اس کو کہتے ہیں سوجھ بوجھ گویا وہ سوتی ہی رہیں۔ اور ہم نے اپنا جادو جگا لیا۔ اب جب وہ بیدار ہونگی۔ اور اپنے اوپر اس کمبل کو دیکھیں گی۔ تو ان کے سوالیہ نشان بنے ہوئے حسین چہرہ کے سامنے ہمارا صرف مسکرا دینا کافی ہوگا۔ اور اس مسکراہٹ پر اُن کی وہ مجوبانہ شکر گذاری اور ہماری شرافت کا وہ خاموش اعتراف بجائے خود نہایت لاجواب قسم کا تعارف ہوگا۔ اس قسم کے تعارف میں عدم واقفیت والی بیگانگی

اور تکلف بالکل نہیں ہوتا۔ بلکہ دراصل تعارف تو پہلے ہی حاصل ہو چکتا ہے۔ کچھ یوں ہی سی خانہ پُری باقی رہ جاتی ہے۔ مقصد تو یہ ہے کہ ان کے دل میں جگہ پیدا کرنے کا ذریعہ چونکہ رسمی تعارف نہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا مستجاب اللہ یہ ترکیب ذہن میں آ گئی۔ اور ہم خوش ہو کر گنگنانے لگے۔ ؎

ہائے اس اون کے کمبل کی یہ قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو محبوب کی سردی کھونا

ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی۔ شاید کوئی اسٹیشن قریب تھا۔ چند ہچکولے کھانے کے بعد ٹرین ٹھیر گئی اور ٹرین کے ٹھہرتے ہی ہمارے ہی ڈبہ میں مسافروں کا وہ سیلاب آیا ہے کہ الٰہی توبہ۔ گٹھری نما پگڑ باندھے ہوئے درجنوں لٹھ بند۔ گھونگھٹ نکالے ہوئے بچوں کو چمٹائے بیسیوں عورتیں، اور پھر ان سب کا سامان بستر، پوٹلے، پوٹلیاں، مختلف قسم کی ترکاریوں کے جھابے۔ برتنوں کی بوریاں، گھی کے پیپے، حقے، ٹوکرے، ٹوکریاں، ایک آفت ہی تو آ گئی۔ کسی نے کسی کے سر پر قدم رنجہ فرمایا تو کوئی کسی کا لے پالک بن کر گود میں بیٹھ گیا۔ کوئی کسی سے ہاتھا پائی میں مصروف ہو گیا۔ اور کسی نے محض مباحثہ کافی سمجھا۔ خود ہمارے بستر پہ ایک محترمہ ایک گز کا گھونگھٹ نکالے اپنے لختِ جگر کو کلیجے سے لگائے دودھ پلا رہی تھیں۔ اور ان کے دوسرے صاحبزادے ہمارے پھول دار تکیہ پر بیٹھے اپنے والد بزرگوار کو بھی وہیں بیٹھ جانے کی تاکید فرما رہے تھے۔ مگر خود ہم اپنے بستر کی طرف سے بے فکر رضائی والی کا سیر بنے کھڑے تھے۔ کہ کوئی ان کے خوابِ ناز میں مخل نہ ہو۔ مگر آخر کب تک؟ جب لوگوں کو کہیں جگہ نہ ملی تو ادھر

بھی متوجہ ہوئے اور ہمارے ایک گنوار کو ڈھکیلتے ہوئے کہا۔

"آنکھیں ہیں منہ پر یا نہیں، دیکھ رہے ہو کہ ایک عورت لیٹی ہے۔ اور گھسے پڑتے ہو۔"

"لیٹی ہیں تو اٹھا کے بٹھاؤ نا ان کو بابوجی۔ ہم آخر کہاں بیٹھیں گے؟ کلوا کی ماں بیٹھ ادھر تو۔"

"نہیں یہاں کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔"

"بیٹھ کیسے نہیں سکتا۔ ہم نے بھی ٹکٹ لیا ہے۔"

"نہیں مانوگے تم، ارے بھائی کہیں اور بیٹھ جاؤ۔ میرے بستر پر بیٹھ جاؤ۔"

رضائی کو پھر جنبش ہوئی۔ کمبل کھسکا۔ تارے جگمگائے۔ اور "استغفراللہ" کہتے ہوئے ایک بزرگ رضائی سے برآمد ہو کر بیٹھ گئے۔ ہم نے مسافروں سے لڑتے لڑتے ان بزرگ محترم کو دیکھا۔ اگر گاڑی کھڑی نہ ہوتی تو شاید زنجیر کھینچ لینے کو دل چاہتا۔ مگر اب اس بوڑھی گھوڑی کی وہ لال لگام دیکھ رہے تھے۔ جس پر کامدانی کا ہر تارہ معلوم نہیں رو رہا تھا یا ہنس رہا تھا۔ دھوتی اوڑھنے والا مسافر اب تک بیٹھا ہوا سو رہا تھا۔ اور کمبل کے باوجود ہماری نیند غائب تھی۔

UMDATUL HUKMAA

عمدۃ الحکماء

کریم کو آپ نہیں جانتے نہ جان سکتے ہیں۔ ہم سے پوچھئے بلکہ ہمارے
دل سے پوچھئے کہ یہ حضرت ہیں کیا چیز، دنیا میں بہت سے ذہین دیکھے ہیں۔
ایک سے ایک چلتے ہوئے بقراطوں سے پالا پڑا ہے۔ مگر یہ شخص تو بلا ہے بلا۔
انگریزی کا ایک لفظ نہیں پڑھا۔ انگریزی اخبار دے دیجئے تو الٹا اور
سیدھا نہ سمجھ سکیں۔ مگر دو سال تک کلب کا ممبر رہا۔ اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہن
کر آتا تھا۔ اور برج کھیلتے ہوئے "نو بٹ" اور "ٹو نو ٹرمپس" کہنے کے
علاوہ کمال یہ تھا کہ لوگ اس سے گھنٹوں انگریزی میں باتیں کرتے تھے۔ اور
وہ "یس" اور "نو" ایسے ایسے مقامات پر کہتا تھا کہ کبھی جو غلطی کرے۔

مدتوں لوگ اس کو گریجویٹ سمجھا کرتے تھے۔ اور جب لوگوں کو معلوم ہوتا تھا۔
کہ یہ حضرت انگریزی کے آس پاس بھی نہیں گذرے تو یقین مشکل سے آتا تھا۔
اردو اور فارسی بھی واجبی ہی سی جانتے تھے۔ مگر شعرا کی محفل میں اس ٹھاٹھ
سے داد دیتے تھے گویا سند عطا کر رہے ہیں۔ پڑھے لکھوں میں بیٹھ کر ادبی
مباحث پر ایسی رائے زنی فرماتے تھے۔ گویا اگر آپ رائے نہ دیتے تو یہ مبحث
تشنہ رہ جاتا۔ پیشہ بظاہر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ مگر مصروفیت بے حد تھی۔
اور یہ بھی دیکھا جاتا تھا کہ اچھے سے اچھا کھاتے ہیں۔ اور اچھے سے اچھا
پہنتے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹی میں پہنچ تھی۔ ہر دفتر میں ایک آدھ دوست
پال رکھا تھا۔ اور ہر محکمہ میں آپ کے واقف کار موجود تھے۔ خیر یہاں تک تو
غنیمت تھا۔ مگر یکایک آپ غائب ہو گئے۔ کسی نے کہا۔ کہ "صاحب ہم پہلے
ہی کہتے تھے کہ وہ انسان نہیں ہے۔ حسنِ ظن سے کام لیجئے تو جن اور سچ پوچھئے
تو بھوت تھا۔" کسی نے کہا "مقروض ہو گیا تھا۔ اپنی شان کے پیچھے خودکشی کر لی
ہو گی۔" عام رائے یہ تھی کہ لڑائی پر چلا گیا۔ اور انیس کا خیال یہ تھا کہ سزا ہو گئی۔
دو سال کے بعد لاہور میں ایک دن انیس نہایت بدحواسی کے ساتھ ہنستا
ہوا گھر واپس آیا۔ انیس مجھ سے ملنے لاہور آیا ہوا تھا۔ مگر میں نے اپنے ہی
محکمہ میں انیس کے لئے بھی ایک جگہ نکلوا کر اس کو اپنے ہی ساتھ رکھ لیا تھا۔
خیر یہ تو ایک غیر متعلق سی بات تھی۔ اس وقت تو میں انیس کی ہنسی سے پریشان
تھا۔ آخر یہ کس دیوار قہقہہ سے آیا ہے۔ کہ ہنسی کسی طرح دم ہی نہیں لینے دیتی
آخر میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "آخر بات تو بتا دو یا خواہ مخواہ کی بدمذاقی کر رہے ہو۔"

انیس نے ہنستے ہوئے کہا "عمدۃ الحکمار" اور پھر وہی پیٹ پکڑ پکڑ کر قہقہے......!

بمشکل تمام آدھ گھنٹہ کے بعد معلوم ہوا کہ کریم زندہ ہیں جیل میں نہیں بلکہ لاہور میں عمدۃ الحکمار بنے ہوئے ہیں۔ اور مطب فرماتے ہیں۔ مطب خوب چل رہا ہے۔ اور اچھی خاصی آمدنی ہے۔

میں نے کہا "مگر سوال تو یہ ہے کہ حکیم بنا کیسے"؟

انیس نے کہا "کہتا ہے کہ باقاعدہ طب پڑھی ہے امتحان دیا ہے سند لایا ہوں۔"

میں نے کہا "مگر بھائی طب پڑھنے کے لئے بھی تو آخر کچھ نہ کچھ پڑھا جاتا ہے۔ اس کا آخر کیا انتظام ہوا ہوگا۔"

انیس نے کہا "اب یہ تم خود اس سے پوچھنا۔ ارے صاحب وہ تو بڑے رعب داب سے مطب کرتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کی بیٹھک میں نہایت شاندار فرش پر مسند اور گاؤ تکیہ لگا کر پیچوان لئے بیٹھا تھا۔ شاگرد نسخے لکھ رہے تھے۔ اور مریضوں کا وہ ہجوم تھا۔ کہ میں کیا کہوں مجھ سے نہایت لئے دیئے ملے اور آج رات مجھے اور تم کو کھانے پر بلایا ہے۔"

شام کو انیس نے ایک شاندار مکان کے قریب جا کر کہا "پڑھئے سائن بورڈ۔ مطب عمدۃ الحکمار حکیم مولوی محمد عبدالکریم صاحب نبیرۂ حکیم الحکمار الحاج حکیم مولوی عبدالغفور صاحب مرحوم طبیب شاہی دربار مہاراجہ صاحب بہادر کچھر وچ" اس عظیم الشان سائن بورڈ کو پڑھ کر بہت سے تندرست

بیمار ہو چکے ہوں گے۔ مگر ہم کو گر ہم یعنی عمدۃ الحکماء بلکہ نبیرۂ حکیم الحکماء نے بیمار ہونے کا موقع بھی نہ دیا۔ اور عین اسی وقت جبکہ ہم سائن بورڈ پڑھنے میں مصروف تھے۔ حکیم صاحب کی مرعوب کر دینے والی لینڈ و پھاٹک پر آکر رکی۔ حکیم صاحب غالباً مریضوں کو دیکھنے تشریف لے گئے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر نہایت خلوص سے معانقہ فرماتے ہوئے کہا "بھئی یہ کیا ستم ہے۔ کہ

ع ہزاروں قربتوں پر یوں مرا مہجور ہو جانا

سوال یہ ہے کہ آخر تم کب سے لاہور میں ہو۔"

ہم لوگ باتیں کرتے ہوئے حکیم صاحب کے ایوان تک پہنچ گئے۔ اس عرصہ میں ان کو لاہور آنے کی وجہ، مدت قیام اور اسی قسم کی حدود اربعہ نما باتیں بتا دیں۔ حکیم صاحب نے ہم کو بٹھاتے اور خود بیٹھتے ہوئے کہا "شادی بھی کی تم نے مسخرے آدمی یا اب تک واحد حاضر ہو۔"

الہام اس کو کہتے ہیں کہ فوراً ایک بات سوجھ گئی۔ عرض کیا۔ جی ہاں! شادی کیا کی ہے ایک مصیبت مول لے لی ہے۔ جب سے نیک بخت آئی ہے ایک دن تو تندرست رہی نہیں۔

انیس نے گھور کر ہم کو دیکھا۔ مگر ہمارے اشارے پر وہ خاموش رہا حکیم صاحب نے توجہ سے پوچھا۔ "کیا علالت ہے؟"

ہم نے کہا "کیا کہوں کریم بھائی دنیا بھر کے علاج کروا لے۔ مگر مرض کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ اب تو گویا گھر ہی کا حکیم ہے تم خود دیکھ لینا۔

آمادگی سے فرمایا۔ "جب کہو آ جاؤں یا جب چاہو لے آؤ۔"

ہم نے وعدہ کر لیا کہ "کل ہی لائیں گے آخر علاج میں بلا وجہ دیر کیوں ہو۔"
حکیم صاحب کے یہاں سے پُر تکلف مقویات تناول کر کے جس وقت ہم دونوں واپس ہوئے۔ انیس نے حکیم صاحب سے رخصت ہوتے ہی بے صبری کے ساتھ پوچھا "آخر یہ حرکت کیا تھی یعنی خواہ نخواہ ایک بیوی بھی تصنیف کر لی۔ اور فی البدیہ اس نو تصنیف بیوی کی علالت بھی۔"

ہم نے کہا "آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔"

انیس نے کہا "مثلاً"

ہم نے کہا "مثلاً یہ کہ بہت بننے لگا ہے یہ، اور قسم لے لو مجھ سے جو طب کی دُم کا بھی اس کو پتہ ہو۔ کل لاؤں گا میں اپنی بیوی کو اور مستقل طور پر ہو گا۔ ان حضرت کا علاج کچھ دن یہی تماشہ سہی۔"

انیس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "وہ ٹھیک ہے۔ مگر بیوی کا انتظام کہاں سے کرو گے۔"

ہم نے کہا "ارے بھائی سخت کودن ہو۔ یعنی تم جو موجود ہو۔"

چلتے چلتے ٹھہر کر بولا "کیا مطلب۔"

ہم نے کہا "مطلب یہ کہ کل تم کو پردہ دار تانگہ پہ لاؤں گا۔ پردہ کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ تمھاری نبض دیکھیں گے۔ حال سنیں گے۔ نسخہ لکھیں گے۔ پھر مستقل طور پر علاج ہوتا رہے گا۔ کبھی تم مجھ کو لے آنا کبھی میں تم کو لے آیا کرونگا۔ جب تم لاؤ گے مجھے تو کہہ دینا میرے متعلق کہ کام پر گیا ہوا ہوں۔ ادھر تم گویا اپنی بھابی کو لے آئے ہو۔ ورنہ میں خود تم کو لے آیا کروں گا۔"

انیس نے اچھل کر کہا۔ سخت لفنگے ہو تم۔ مگر تمہاری قسم رہے گا لطف۔"
دوسرے دن انیس کو پردہ دار تانگہ میں لے کر جب ہم عمدۃ الحکماء کے مطب میں پہنچے ہیں تو واقعی عقل کے مریضوں کا کافی ہجوم تھا جو اس جاہلِ مطلق کو طبیب حاذق سمجھ کر مرنے کے لئے یہاں جمع تھے۔ حکیم صاحب نے ہم کو دیکھتے ہی اپنے دوسرے مریضوں کو چھوڑا اور خود اٹھ کر تانگہ کے قریب آ گئے۔ ہم نے عرض کیا۔
"میں مختصراً حال بیان کر دوں پہلے۔"
ڈانٹ کر بولے "نہایت بدتمیز ہیں آپ، ٹھہریئے۔ آداب عرض بھابی"!
ہم نے پردہ کے اندر منہ ڈال کر دیکھا تو انیس کا ہنسی کے مارے دم نکلا جاتا تھا۔ لہذا ہم نے ذرا بلند آواز سے کہا "تم خود کیوں نہیں کہتی ہو۔ اچھا...... اچھا ...... خیر...... بھئی وہ سلام کہہ رہی ہیں۔"
حکیم صاحب نے فرمایا "ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اب بیان کیجئے حال۔"
ہم نے کہا "بھئی ان کی علالت کا سلسلہ ایک سال سے چل رہا ہے......
حکیم صاحب نے بات کاٹ کر کہا۔ آپ بیان کرتے رہیئے میں نبض دیکھوں گا ذرا۔" یہ کہہ کر حکیم صاحب نے پردہ میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور انیس نے نبض دکھانے کے لئے ہاتھ دے دیا۔" ہم نے بیان کرنا شروع کیا۔
پہلے تو ان کو صرف نزلہ تھا مگر کچھ ہی دنوں کے بعد انسائیکلوپیڈیا کے دورے پڑنے لگے۔"
حکیم صاحب نے سمجھتے ہوئے کہا "اچھا...... اچھا...... پھر......"
ہم نے کہا "انسائیکلوپیڈیا کے دوروں نے ان کو بہت کمزور کر دیا۔"

حکیم صاحب نے کہا: "وہ تو ہونا ہی ہے۔ پھر ۔"

ہم نے کہا: "ان دوروں کا علاج حکیم محمد امین صاحب نے کیا۔ دورے تو جاتے رہے۔ مگر وٹامن ڈی کی شکایت ہو گئی ۔

حکیم صاحب نے تشویش سے کہا: "ارے۔ رے ۔ رے حکیم امین صاحب کو پہلے سے روک تھام کرنا تھی ۔"

پردہ کے اندر سے آواز آئی: "کہوں کہوں ۔ کہی کہی ۔"

ہم نے برجستہ کہا: "اب آج کل یہ حال ۔ کہ تھوڑی دیر کے بعد ٹرانسمٹر ہو جاتا ہے"

حکیم صاحب نے کہا: "وہ تو میں دیکھ رہا ہوں ۔ کچھ تشنجی کیفیت بھی ہے اور نبض کی رفتار بھی بہت تیز ہے ۔"

ہم نے کہا: "یہاں لاہور میں ڈاکٹر ممتاز صاحب کا علاج تھا ۔ ان کا خیال ہے کہ پرانی قسم کا کانسٹی ٹوپی ہے ۔"

ذہانت دیکھئے کہ کانسٹیٹی ٹوپی ہے ۔"

ذہانت دیکھئے کہ کانسٹیٹی ٹوپی پر کانسٹی پیشن کا شبہ کر کے کہا: "قبض کی شکایت بھی ہے ۔"

ہم نے کہا: "جی ہاں نہایت سخت اور اختناق الرحم کی مریضہ بھی رہ چکی ہیں ۔ پھر یہ کہ بچپن میں ایک مرتبہ دلا ڈی واسٹک کا شدید حملہ ہوا تھا ۔"

حکیم صاحب نے غور سے سنتے ہوئے کہا: "کچھ حالات مجھ کو دائی سے بھی پوچھنا ہوں گے ۔"

ہم نے کہا "میں نے ان کو لیڈی ڈاکٹر کو بھی دکھایا تھا وہ کہتی ہے۔ کہ یہ سب فزکس کی خرابی ہے۔"

حکیم صاحب نے کہا "بکتی ہے اس کا تو کہیں پتہ بھی نہیں ان کے لئے نسخہ لکھتا ہوں۔ انشاء اللہ ایک ہفتے میں دیکھئے گا کتنا فرق ہوتا ہے۔ بڑے بڑے ناموں کی جو بیماریاں آپ کو اور ان کو بتادی گئی ہیں۔ ان کا کم سے کم اب کوئی اثر نہیں ہے۔ اگر ان کو مقوی بدن اور مولدِ خون ادویہ دی جائیں۔ تو آنتوں کا، جگر کا، اور گردوں کا طبعی وظیفہ اعتدال پر آجائے گا۔ دراصل اُن کے لئے تحفظ قویٰ کی اشد ضرورت ہے۔"

ہم نے کہا۔ اور حکیم صاحب رڈیارڈ کپلنگ۔؟

کہنے لگے "نہیں صاحب وہ نہیں بالکل نہیں۔ آپ آیئے میں نسخہ دیتا ہوں۔"

حکیم صاحب سے جب وقت نسخہ لے کر ہم لوٹے ہیں۔ انیس کی حالت غیر تھی۔ سانس اکھڑ چکی تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ہاتھ پاؤں یخ ہو رہے تھے بمشکل تمام جب اس کی حالت قابل اطمینان ہوئی تو اُس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "میں اس مذاق میں مر جاؤں گا۔ ناممکن ہے۔ ضبط کرنا"

ہم نے کہا "اب کل یہ کرنا کہ میں تانگہ میں رہوں گا۔ اور تم حکیم صاحب سے حال کہنا۔"

انیس نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "نا بابا مجھ سے ضبط نہ ہو سکے گا فوراً ہنسی آجائے گی۔ یہ کمبخت تو جیسا کلب کا ممبر ہو جیسا برج کا کھلاڑی تھا ویسا ہی حکیم بھی ہے۔

ہم نے کہا: "مگر دیکھتے ہو کہ کسی جگہ اپنی نااہلی کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔"

انیس نے کہا: "مگر ایک بات ہے کہ اب اس کو کچھ طبی باتیں کرنا آگئی ہیں۔ مثلاً مقوی بدن۔ مولدِ خون۔ جگر اور گردوں کا طبعی وظیفہ۔ تحفظ قوی۔ اس نے طب ا پر ڈھی ضرور ہے۔"

ہم نے وثوق سے کہا: "احمق ہیں آپ، میں لکھ کر دے سکتا ہوں۔ کہ یہ تمام معلومات دواخانوں کے اشتہارات سے حاصل کی ہیں۔ آخر نوبٹ اور ٹونورٹمیس کبھی تو کہنا تھا۔

انیس نے کہا: "مگر اس مذاق کا نتیجہ کیا ہوگا۔"

ہم نے کہا: "بڑا نتیجہ خیز مذاق ہے جناب کم سے کم اس کو یہ تو معلوم ہی ہو جائے گا۔ کہ ہم لوگ اتنے گدھے نہیں ہیں جس قدر صورت سے نظر آتے ہیں اس کو صرف یہ بتا دینا ہی کافی ہے۔ کہ اور کوئی سمجھے یا نہ سمجھے مگر ہم کو معلوم ہے۔ کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔"

دوسرے دن ہم تو تانگے میں رہے اور انیس نے حکیم صاحب سے گویا اپنی بھابی کا حال کہہ دیا کہ دائی نے دیکھ کر کیا بتایا ہے۔ اور کل دوا پینے کے بعد ان کی کیا کیفیت رہی حکیم صاحب نے تانگہ کے پاس آکر ہماری نبض دیکھی۔ انیس حال بیان کر رہا تھا: "دائی کا خیال یہ ہے کہ رحم میں کچھ انٹرنیشنل کیفیت ہے۔"

حکیم صاحب نے کہا۔ یہ۔ یہ اسی کا خیال تھا مگر آج نبض کی حالت بہتر ہے۔"

انیس کمبخت نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا مارے ہنسی کے قلابازی کھا گیا۔ اور حکیم صاحب حیران کہ ماجرا کیا ہے۔ آخر خود ہم کو حکیم صاحب کی حیرت دور کرنے

کے لئے باہر آنا پڑا۔ حکیم صاحب نے اور بھی بھونچکا ہو کر پوچھا۔ یہ یعنی کیا حرکت تھی؟"

دیر تک ہنسنے کے بعد ہم نے کہا "صرف تم کو یہ بتانا تھا کہ تم کم سے کم ہم سے

نہ بنو۔ تمہاری اس طبابت کے ڈھونگ کو ہم خوب سمجھتے ہیں۔"

انیس نے ہنستے ہوئے کہا "مگر کمال ہے کریم کہ ایسا باقاعدہ حکیم بنا

بیٹھا ہے۔"

حکیم صاحب نے سنجیدگی سے کہا "وہ تو میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ نبض تو

ہے مردانہ اور بیماریاں جتنی بتائی ہیں وہ سب زنانہ ہیں آخر یہ ماجرا کیا ہے؟"

انیس نے ہنستے ہوئے کہا "اسے قتل کر ڈالو۔ بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دو

مگر کیا مجال ہے کہ اپنے بہروپ کو کبھی بھی تسلیم کرے؟"

حکیم صاحب نے کہا "مگر لاحول ولاقوۃ ایسا خطرناک مذاق کرتے ہو۔

اچھا میں بھی سمجھوں گا تم سے؟"

سمجھتے تو خیر وہ کیا مگر دنیا کو اپنا حکیم ہونا سمجھا خوب رہے ہیں۔ مطب میں

ہجوم بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اور روپیہ کی موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ حکیم صاحب

سے پوچھنا یہ ہے کہ گدھے کے لئے خشکہ مفید ہوتا ہے یا مضر؟

بیگم یہ نعرہ سنکر ہماری طرف آتے ہوئے بولیں "کیا بات ہے۔"

ہم نے کہا "کچھ نہیں، کوئی بات نہیں۔ آپ ایک پان جاتی لائیے۔ اور پھر اس ملازمہ سے کہا۔ کیا کہا ہے بیوی نے؟"

اُس بدتمیز نے پھر اسی مشکوک انداز سے ساتھ کہا۔ بیوی نے کہا ہے کہ "ناچونا چو پیارے من کے مور والا" ریکارڈ دیدیجئے تھوڑی دیر کے لئے ننھے میاں کھیل رہے ہیں۔ ابھی واپس کر دیں گی۔"

ہم لاحول پڑھتے ہوئے ریکارڈوں کی الماری کی طرف گئے۔ وہاں پان لیے بیگم پہلے سے موجود تھیں۔ اب چونکہ اُن کو بتانے میں کوئی حرج نہ تھا۔ لہٰذا ہم نے صاف کہدیا۔ کہ "آپ کی ہمسائی صاحبہ نے ناچونا چو پیارے من کے مور والا ریکارڈ مانگا ہے۔"

بیگم نے جل کر کہا "ان کو تو ہمارے گھر ہی کی وجہ سے اپنی کسی ضرورت کی چیز خریدنے کی ضرورت ہی نہیں رہی ہے۔ بجلی کی استری منگائی جلا کر ناس مار دی۔ ریڈیو دیکھ گئی تھیں۔ ابھی اسی ہفتہ میں اپنی چند دوستوں کو چائے پر بلا لیا۔ اور ہمارا ریڈیو منگا بھیجا۔

سلائی کی مشین مانگ کر چھکڑا کر دی ہے۔ اس دن دعوت میں ڈنر سٹ منگایا۔ ایک ڈونگا توڑ کر سٹ بیکار کر دیا۔

وہ یہ تفصیلات بتا رہی تھیں۔ کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔ اب جو ہم لپک کر باہر پہنچے ہیں۔ تو ان ہی ہمسائی کے شوہر نامدار کھیسیں نکالے کھڑے ہیں۔ آداب عرض! کہیے مزاج تو اچھا ہے۔ ذرا ایک گھنٹہ کے لئے بائیسکل چاہیئے

Parosi Azab

پڑوسی عذاب

صبح کے وقت شیو کرنے کے لئے آئینہ کا رُخ درست کیا ہی تھا کہ اس میں بجائے اپنے ہمسائی کی ملازمہ کا عکس نظر آیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ کھڑی دوپٹہ چبا رہی تھی

ہم نے پوچھا: "کیوں کیا ہے؟"

بہت ہی لجا کر اُس نے کہا: "بیوی نے سلام کہا ہے۔ اور کہا ہے: کہ ناچو ناچو پیارے من کے مور"

ہم نے ایک دم سے نعرہ بلند کیا: "اچھا؟ کیا مجھ سے کہا ہے۔ یہ مجھ سے کہا ہے؟"

کھٹی۔ کانجی ہاؤس تک جاؤں گا۔ سنا ہے کہ بکری وہاں ہے۔"

ہم بغیر کچھ جواب دیئے ہوئے گھر میں آ کر سر پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے دل نے ایک پھڑکتی ہوئی چیز شروع کر دی ؎

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے — کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

بیگم نے لاکھ پوچھا کہ آخر بات کیا ہے کیوں چپ ہو گئے۔ مگر ہم خاموشی کے ساتھ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ آخر دل ہی دل میں ایک نتیجہ پر پہنچ کر بیگم سے تو کہا۔ "آپ ذرا ہٹ جائیے" اور ہمسائی کے شوہر نامدار کو آواز دے کر کہا "ڈاکٹر صاحب آ جائیے اندر" یہ دراصل گھوڑا ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر صاحب بدستور اپنا ہنستا ہوا چاند سا مکھڑا لیکر تشریف لائے تو ہم نے عرض کیا۔ تشریف رکھیے۔ مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سوالیہ نشان بن کر بیٹھ گئے تو ہم نے فیصلہ کن انداز سے بات کرنے کے لئے پہلے تو اپنے اخلاق کو لوریاں دے کر سلایا۔ اس کے بعد اخلاقی جرأت کو جگایا۔ ذرا دل کو مضبوط کیا۔ کچھ کھنکھارے کچھ کسمسائے اور آخر ڈھنگ بن کر کہنا شروع کیا "ڈاکٹر صاحب بات اصل میں یہ ہے کہ میں یہ مکان چھوڑ رہا ہوں۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی اور مکان ہو تو بتائیے۔ میں اس مکان سے عاجز آ چکا ہوں"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "کس قسم کا مکان چاہتے ہیں آپ"؟

اب ہم نے دل کی بات کہنا شروع کر دی "مکان خواہ کیسا ہی ہو مگر اس کے چاروں طرف دور دور تک آبادی نہ ہو، کوئی اور مکان ایسا نہ ہو جس کے رہنے والے اپنے کو میرا پڑوسی کہہ کر مجھ کو اپنی تمام ضروریات کا کفیل سمجھیں اور میری تمام

ضروریات کی چیزوں کو مارے مروت کے اپنا سمجھیں۔ معاف کیجئے گا بجھے گھما پھرا کر بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ آپ کے یہاں ایک بکری ہے آپ نے کبھی مجھ کو بھی دیکھا ہے کہ میں آپ کے یہاں جا کر یہ کہتا کہ مجھے اس وقت ذرا مغموم ہونیکی ضرورت ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اپنی بکری دیدیجئے یا مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے گلے میں یہ چاندی کا خلال لٹک رہا ہے۔ مجھے تقریباً روزانہ کھانا کھانے کے بعد خلال کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مگر میں دیا سلائی کی تیلیوں سے نیب کے تنکوں سے یا چلمن کو توڑ توڑ کر یہ ضرورت پوری کر لیتا ہوں۔ مگر آپ کو یہ تکلیف نہیں دیتا کہ ذرا اپنا خلال دیدیجئے۔ مگر آپ کے یہاں کا عجیب طریقہ ہے۔ ماشاءاللہ آپ لوگ نہایت شوقین واقع ہوئے ہیں ہر چیز کا شوق ہے۔ بچے کو گراموفون کا بیگم صاحبہ کو سینے کی مشین کا۔ خود آپ کو بائیسکل کا۔

ڈاکٹر صاحب نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ہم نے ان کو چپ رہنے کی تاکید کرتے ہوئے کہا۔" میری پوری بات سن لیجئے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا۔ کہ اتفاق سے آپ کے گھرانے کے تمام شوق میرے اور میرے بال بچوں کے ہر شوق سے ملتے جلتے ہیں۔ بظاہر یہ بہت معمولی سی بات ہے کہ بیگم صاحبہ نے ناچو ناچو پیارے من کے مور، والا ریکارڈ منگا بھیجا ہے۔ اخلاقاً مجھے بھیج دینا چاہیئے تھا۔ لیکن آپ کو کیا معلوم کہ اس ایک ریکارڈ کو بھیجنے کے ساتھ ہی مجھ کو کتنے انتظام کرنا پڑیں گے۔ میں ریکارڈ کو حسرت سے رخصت کروں گا۔ کہ ممکن ہے کہ اس کا بھی آپ کے یہاں یہاں وہی حشر ہو جو اس کے بزرگ یعنی " پیا مینڈکی ری تو تو پانی میں کی رانی " والے ریکارڈ کا ہوا ہے کہ اس کے متعدد ٹکڑے آپ کے ان الفاظ کے ساتھ آ گئے

تھے۔ کہ ننھے میاں ذرا اس پر کھڑے ہو گئے تھے۔ اس حسرت کے علاوہ مجھے ریکارڈ
کے ساتھ سوئیاں بھی بھیجنا پڑتی ہیں۔ اس لئے کہ مجھے معلوم ہے۔ کہ آپ فضول خرچ
نہیں ہیں۔ محض ایک ریکارڈ کے لئے اور وہ بھی اس ریکارڈ کے جو آپ کا ذاتی
نہ ہو ہرگز سوئیوں کی نئی ڈبیا نہ خریدیں گے۔ بلکہ گھسی ہوئی سوئیوں سے میرے ہی
ریکارڈ کا ناس ماریں گے۔ سلائی کی مشین آپ کے یہاں زیادہ تر مہمان رہتی ہے اور
خود ہمارے یہاں کے کپڑے درزیوں کو دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ تحقیق سے یہ بھی
معلوم ہوا ہے۔ کہ آپ کے یہاں اس مشین سے سلائی کا کام کم لیا جاتا ہے۔ البتہ
ننھے میاں اس سے ریل گاڑی کا کھیل بہت شوق سے کھیلتے ہیں۔ ڈنر سٹ میں
آپ کو تحفہ کے طور پہ دینے والا ہوں۔ اس لئے کہ اس کا ایک ڈونگا توڑ کر میرے
لئے پورے سٹ کو آپ نے بیکار کر دیا ہے۔ اب بائیسکل آپ مانگ رہے ہیں۔
یعنا مجھے دفتر جانے کے لئے گویا تانگہ ڈھونڈھنا چاہیئے۔ اس لئے کہ اول تو
آپ کا کچی ہاؤس سے واپس ہی مشکل سے آئیں گے۔ دوسرے جب آئیں گے تو
مجھ پر آنکھیں نکالتے ہوئے کہ عجیب بائیسکل ہے۔ آپ کی مشکل سے دو قدم چلی
ہو گی۔ کہ پنکچر ہو گیا۔ ان تمام حالات کے ماتحت اگر کوئی مناسب سا مکان آپ
کی نظر میں ہو تو ضرور بتایئے گا۔"

ڈاکٹر صاحب بھنائے ہوئے اٹھے طنز سے کہا! شکریہ آپ کا" گھر میں جا کر
چیخنے چلائے اور اس کے بعد سے ایسا امن ہے کہ گویا وہ ہمارے یا ہماری کسی چیز
کی پڑوسی ہی نہیں ہیں۔ ایسی بھی کیا بے مروتی۔"!

لکھنؤ

دریائے گومتی کے کنارے سرکاری طور پر ایک شہر آباد ہے جس کو لکھنؤ کہتے ہیں۔ مگر ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا خیال یہ ہے کہ یہ ہرگز وہ لکھنؤ نہیں ہے جو دراصل لکھنؤ تھا۔ بلکہ خالص لکھنؤ اصلی لکھنؤ یں خدا جانے کہاں روپوش ہو گیا ہے۔ اور ہم سب کے پیش نظر بناسپتی لکھنؤ ہے جس کو لکھنؤ کہنے کے لئے ہم اس لئے مجبور ہیں۔ کہ اسٹیشن پر یہی نام لکھا ہوا ہے۔ خالص لکھنؤ کے روپوش ہونے کے متعلق بہت سی روایات مشہور ہیں۔ مگر سب سے زیادہ قرین قیاس یہ روایت ہے۔ کہ بیرونی میل جول سے بچانے اور ٹکسال باہر کو ٹکسال اندر کرنے

کے خوف سے لکھنؤ دانستہ چھپا دیا گیا ہے۔ اور اس کا پتہ ایک ایسا راز ہے۔
جس کے جاننے والے رفتہ رفتہ کم ہوتے جاتے ہیں۔ یعنی یہ راز روز بروز محفوظ
ہو رہا ہے۔ لکھنؤ کے محل وقوع کے راز میں ہونے کی وجہ سے حدود اربعہ بھی
ڈانواں ڈول پھر رہا ہے۔ اور بڑے بڑے سراغ رسانوں کا خیال یہ ہے۔ کہ جس
دن حدود اربعہ مقرر اور معین ہو گیا۔ محل وقوع کا پتہ لگانا زیادہ مشکل نہ رہے گا۔
چند چیزیں جو مدت کی کوششوں کے بعد معلوم ہو سکی ہیں۔ وہ بہت امید افزا
ہیں۔ مثلاً آب و ہوا کے متعلق خیال یہ ہے کہ وہ اب تک جوں کی توں ہے بشرطیکہ
آب اور ہوا دونوں کو علیحدہ علیحدہ نہ کیا جائے۔ ورنہ ان دونوں کے علیحدہ
ہو جانے کی صورت میں یہ اندازہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔ کہ خالص لکھنؤ میں نہ آب
تھا نہ ہوا تھی۔ اس لئے کہ اگر یہ دونوں چیزیں ہوتیں تو میونسپل بورڈ کو نلوں کے
ذریعہ آب کا اور بجلی کمپنی کو پنکھوں کے ذریعہ ہوا کا انتظام کرنے کی زحمت ہرگز
نہ ہوتی۔ بلکہ یہ دونوں محکمے کچھ اور مفید خدمات انجام دیتے۔ جدید لکھنؤ کو
جب یہ محسوس ہوا۔ کہ زندگی کے لئے ہوا۔ اور پانی بھی ضروری ہیں۔ تو اس نے
دو محکمے خاص طور پر ان ہی اغراض کے لئے قائم کئے۔ چنانچہ اب پانی ملے یا نہ ملے
مگر جن کمروں میں نل ہیں وہاں یہ اطمینان ضرور رہتا ہے۔ کہ اگر پانی ہوگا تو ملے گا
ضرور۔ بالائی مکانات چونکہ لکھنؤ کی عام سطح سے بلند ہوتے ہیں۔ لہذا وہ
حدود میونسپلٹی میں نہیں آتے۔ اور وہاں تک پانی پہنچانے کی کوئی اخلاقی ذمہ داری
بھی مشکل ہی سے لی جا سکتی ہے۔

عام آب و ہوا کی طرف سے اہل شہر اب مطمئن ہیں۔ کہ اس کے بدولت کم

سے کم آبادی بڑھنے نہیں پاتی لکھنؤ کی کشش نے سارے ہندوستان کو اپنی طرف سمیٹ لیا تھا۔ اور اندیشہ تھا کہ کہیں لکھنؤ کو ہندوستان نہ بننا پڑے۔ اس لئے بہت دنوں کی کوششوں کے بعد اب آب و ہوا کو ایسا بنایا جا سکا ہے۔ کہ آبادی کا توازن قائم رہے۔ طرح طرح کے وبائی امراض ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لائے گئے۔ اور ان کو جدید سائنٹیفک اصولوں سے ترقی دی گئی۔ تو اب آبادی کے سلسلہ میں آمد و خرچ برابر ہو سکا ہے اور انتظام ایسا ہو گیا ہے۔ کہ آئندہ بھی یہ توازن گڑبڑ نہ ہونے پائے گا۔

آبادی کے سلسلہ میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ لکھنؤ کی ذاتی آبادی اب کچھ نہیں ہے۔ لوگ باہر سے آکر آباد ہو جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لکھنوی بن کر رہ جائیں۔ اس سرزمین نے جن کو پیدا نہیں کیا ہے۔ ان کو بھی نہایت شفقت سے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ پھر بھی لوگ اپنے نام کے ساتھ لکھنوی لکھ لکھ کر یہ ثابت کرتے رہتے ہیں۔ کہ لکھنؤ کی اپنی ذاتی آبادی بھی ہے۔ اور لکھنؤ ہر چند کہ نہیں ہے مگر ہے ضرور۔

جن چیزوں کا اب تک پتہ چل چکا ہے۔ ان میں سے ایک پیداوار بھی ہے لکھنؤ کی خاص پیداوار یہاں کے شاعر ہیں۔ جو عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ اور اس کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ کہ گذشتہ مردم شماری کے اعداد سے شاعروں کی تعداد زیادہ تھی۔ شاعر لکھنؤ میں اس شخص جگہ یا چیز کو کہتے ہیں۔ جس کے نام کے ساتھ ایک تخلص بھی لگا ہو۔ لکھنؤ کی یہ مخلوق شعر کہتی اور داد کے سہارے جیتی ہے۔ اس خاص مقصد کے لئے آئے دن مشاعرے منعقد

ہوتے رہتے ہیں۔ تاکہ داد ملتی رہے۔ اور شاعر باقی رہیں۔ اس پیداوار کو فروغ دینے کے لئے اس کی عام اجازت ہے کہ جس کا جی چاہے شاعر بن جائے۔ نہ کوئی اخلاقی پابندی ہے نہ کوئی قانونی روک تھام۔ مشاعرے بھی بغیر حکام کی اجازت حاصل کئے ہوتے رہتے ہیں۔ اور قابل دست اندازی پولیس نہیں سمجھے جاتے۔

تجارت کے سلسلہ میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے لکھنؤ ہمیشہ سے تاجر ہونے کے بجائے گاہک ہونا پسند کرتا چلا آیا ہے۔ پھر بھی چونکہ ایک شہر کے لئے باشندوں کا ہونا اور بازاروں میں دوکانوں کا ہونا ضروری ہے۔ لہذا یہاں بھی کنکوؤں کی تجارت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ویسے بالائی اور شیرمالوں کی دوکانیں بھی پائی جاتی ہیں۔ بید مشک کی کھپت بھی زیادہ ہے۔ اور دوکانیں بھی کافی۔ مگر یہ کوئی تجارت بھی نفع کی غرض سے نہیں کی جاتی بلکہ محض اخلاقاً اور اس طرح کہ گویا مقطع میں سخن گسترانہ بات آپڑے۔

صنعت و حرفت کے سلسلے میں لکھنؤ کو خاص شہرت حاصل رہی ہے یہاں کی خاص صنعت یہاں کی زبان ہے۔ زبان کے بہت بڑے بڑے کارخانے ہیں جہاں زبان ڈھالی جاتی ہے۔ محاورے تیار کئے جاتے ہیں۔ تیار شدہ محاورں کی مرمت ہوتی ہے۔ زبان سے عیوب نکالے جاتے ہیں۔ اس کو صاف کیا جاتا ہے۔ اس میں شیرینی پیدا کی جاتی ہے۔ اس کو نرم اور لطیف بنایا جاتا ہے۔ اس میں نہایت دل آویز لوچ اور نہایت دلکش لچک پیدا کی جاتی ہے باہر سے آئی ہوئی زبان درآمدیوں کو جانچا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ زبان کے سلسلہ میں تمام خدمات انجام پاتی ہیں۔ حرفت میں یہاں کا تکلف خاص طور پر مشہور ہے

اس میں علم مجلس نشست و برخاست۔ ملنے جلنے۔ بات کرنے۔ کپڑا پہننے۔ کھانا کھانے مختصر یہ کہ ہر موقع کے لئے پُر تکلف آداب وضع کیے جاتے ہیں۔ اور جو آداب وضع ہو چکے ہیں۔ ان کی حفاظت کی جاتی ہے۔ بات کرنے کے اوزان مقرر ہیں۔ اور ان اوزان کی پابندی سے بات کرنا بجائے خود صنعت بھی ہے اور حرفت بھی۔

تعلیم کے سلسلہ میں صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ یہاں تعلیم کی چنداں ضرورت نہیں۔ تعلیم کا مقصد شعور پیدا کرنا ہے۔ اور شعور یہاں بغیر تعلیم کے بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ لہذا اس تضیعِ اوقات کی ضرورت بہت کم محسوس کی جاتی ہے۔ پھر بھی بہت سی بیکار چیزوں کی طرح یہاں بھی کافی تعلیمی ادارے ہیں۔ جن میں کھیل کود کا شغل رہتا ہے۔

روزگار عموماً بے روزگاری کا ہے۔ اور اگر بے روزگاری کا سلیقہ کسی خطہ میں پایا جاتا ہے تو لکھنؤ میں۔ یہاں کا بے روزگار سے بے روزگار انسان بھی اس قدر مصروف نظر آتا ہے۔ گویا بیک وقت کئی محکموں کا انچارج ہے یہاں تک کہ آپ اس کو بے روزگار کہنے کی جرأت مشکل ہی سے پیدا کر سکتے ہیں۔

عام حالات یہ ہیں کہ یہاں کبھی عام حالات پیدا نہیں ہوتے ہر عمومیت میں ایک نہ ایک خصوصیت ضرور ہوتی ہے۔ یہاں کی غریبی بھی عام غریبی سے مختلف ہے۔ اور امیری بھی عام امیری سے جداگانہ۔ غربا میں ایک خاص وقار اور امرا میں ایک خاص انکسار پایا جاتا ہے۔ اپنی اصل حالت کوئی کسی کو نہیں بتاتا یہی وجہ ہے کہ کوئی بات بھی عام نہیں ہونے پاتی اور کسی قسم کے

حالات عام حالات نہیں بنتے۔

اتنی باتوں کے معلوم کر لینے کے بعد بھی سُراغ رسانوں کو گم شدہ لکھنؤ کا اب تک پتہ نہیں چلا۔ مگر تحقیقات جاری ہے۔ اور تفصیلات کا انتظار، خیال غالب ہے کہ لکھنؤ اگر واقعی اب تک موجود ہے تو ضرور مل کر رہے گا۔ اور ایک مرتبہ مل جانے کے بعد پھر اُس کا گم ہونا اس محکمۂ آثارِ قدیمہ کے دور میں آسان نہ رہے گا۔



بُرائیوں کی اچھائیاں

بعض اوقات بغیر خودستائی کے کام بھی تو نہیں چلتا۔ مثلاً اسی وقت مجھکو اپنے ایک شریفانہ معمول کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ اور کسر نفسی چاہتی ہے کہ میں اپنی اس خصوصیت کو بیان نہ کروں جو اس دور کے انسانوں میں خال خال نظر آئے گی۔ اور جس میں یہ خصوصیت زندہ ہوگی۔ وہ یقیناً میری ہی طرح فرشتہ خصلت ہوگا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ میری اس قابل قدر خصوصیت کو دنیا خود ہی سمجھتی۔ مگر دنیا سمجھدار نہیں ہے تو میں کیوں یہ ناسمجھی کروں کہ کسر نفسی سے کام لے کر چپ رہ جاؤں اور میری یہ قابل نمائش خصوصیت گمنامی میں پڑی سڑا کرے

آج کل تو اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا زمانہ ہی ہے۔ لوگ تو بات کی بات پر اپنے ڈھول پیٹا کرتے ہیں۔ چنانچہ جب جی چاہے برلن ریڈیو سن کر دیکھ لیجیے۔ اپنی شان میں خود قصیدہ پڑھنے کی اس سے زیادہ بھونڈی مثال میری سمجھ میں اس وقت کوئی اور نہ آسکی۔ لہٰذا برلن ریڈیو کا ذکر کر دیا۔

میری وہ قابل پرستش خصوصیت جس کا میں ذکر کر رہا ہوں یہ ہے کہ میں ہر برائی میں اچھے پہلو ڈھونڈھا کرتا ہوں۔ برائی کو برائی تو سب ہی کہہ سکتے ہیں۔ مگر برائی میں بھلائی ڈھونڈھنا کتنا شریفانہ جذبہ ہے۔ پھر بھی مجھے کوئی شریف نہ کہے۔ تو یہ اس کی شرافت ہے۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ شیشے کا گلاس جب ٹوٹ جاتا ہے۔ تو میں اس کے ٹوٹنے پر افسوس کرنے کے بجائے اس خیال سے خوش ہوتا ہوں کہ اب نیا گلاس آئے گا۔ میرا بچہ امتحان میں فیل ہو جاتا ہے تو ایک سال ضائع ہونے کا صدمہ کرنے کی جگہ مجھ کو اس خیال سے اطمینان ہو جاتا ہے۔ کہ اب اس کی بنیاد مضبوط ہو جائے گی۔ چھوٹا بچہ اگر کوئی کتاب پھاڑ ڈالتا ہے۔ تو میں شکر بجالاتا ہوں کہ اس وقت اس کے ہاتھ نوٹ پڑ جاتا۔ تو کیا ہوتا مجھے اگر کبھی بخار آجاتا ہے۔ تو میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ کہ اس نے بیمار ڈالنے کے لئے بخار ہی تجویز کیا ہو سکتا تھا کہ فالج گرتا۔ کالرہ ہو جاتا۔ چیچک نکل آتی گٹھیا کا مرض ہو جاتا۔ یا مرگی کے دورے پڑنے لگتے مختصر یہ کہ مجھ کو یقین ہے۔ کہ اگر میری ہی طرح کسی شخص کی یہ عادت ہو جائے کہ وہ ہر مصیبت کے وقت اس سے بڑی مصیبت کو یاد کر لیا کرے۔ یا اس مصیبت کے فوائد پر غور کر لیا کرے۔ تو مصیبت دراصل اتنی پریشانی کی چیز نہیں ثابت ہو سکتی۔

جس قدر اس کو پریشان کن سمجھ لیا جاتا ہے۔

وہ بدنصیب ہیں جنہیں غم ناگوار ہے
یہ تو دلیل رحمتِ پروردگار ہے

مثلاً آج کل کی سب سے بڑی مصیبت لڑائی کو سمجھا جا رہا ہے لوگ بدحواس ہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ اور کیا ہونے والا ہے۔ مگر میں ہوں کہ اس لڑائی کے احسانات سے دبا جا رہا ہوں۔ اور جتنا جتنا غور کرتا ہوں اُتنے ہی یہ احسانات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ لڑائی کے جتنے بُرے پہلو ہیں اُن کو دماغ کے سامنے آنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ میں نے اس جنگِ عظیم کو مختلف پہلوؤں سے جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور ہر پہلے سے اُس کی خوبیوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں۔ مثلاً کسی بہت دور کی اور غیر متعلق سی بات کو لے کر آپ میرے اس نظریے کا امتحان کر سکتے ہیں۔ فرض کر لیجئے کہ آپ کا دلچسپ ترین موضوع ہے جغرافیہ، بظاہر جنگ کو جغرافیے سے بہت بڑا تعلق ہے۔ حالانکہ جنگ کے زمانے میں جغرافیہ کی سب سے زیادہ گڑبڑ ہوتی ہے۔ نقشے بدل جاتے ہیں۔ ملک کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ مقامات کے نام تبدیل ہو جاتے ہیں۔ شہر پرگنے اور پرگنے ملک بن جاتے ہیں۔ مگر جغرافیائی نقطۂ نظر سے ان خرابیوں پر غور کرنے کے بجائے تو میں یہ سوچا کرتا ہوں کہ مدتوں اسکول میں جغرافیہ پڑھا ہے۔ اور ایک مرتبہ نو وولاوڈی واسٹک کو بحر روم کا ایک ٹاپو لکھنے کے سلسلے میں فیل بھی ہونا یاد ہے۔ مگر اس جنگ نے جو جغرافیائی معلومات بہم پہنچائی وہ کورس کی کسی کتاب نے بہم نہیں پہنچائی تھی۔ یورپ کے بڑے بڑے شہروں کے نام یاد نہ رہتے تھے۔ اور ان ناموں

پر ہمیشہ یہ شبہ ہوا کرتا تھا۔ کہ یہ کسی مغربی شاعر کا تخلص ہے۔ یا کسی مقام کا نام۔ مثلاً اس قسم کی غلطی کا ہر وقت امکان رہتا تھا۔ کہ روڈیارڈ کپلنگ اور لینن گراڈ میں سے کون شاعر ہے اور کون شہر۔ مگر اب اس جنگ کی بدولت بڑے بڑے مغربی شہر تو کیا چھوٹے چھوٹے قصبوں کے نام، ان کا مقام وقوع، ان کا حدود اربعہ، ان کی آب وہوا۔ ان کی درآمد برآمد وغیرہ وغیرہ تک سب ہی کے فاضل بن بیٹھے ہیں۔ یعنی ہندوستان کے مختلف مقامات کے متعلق ہماری معلومات کا دریا مواج ہے۔ اب آپ ہی بتلایئے کہ یہ جنگ کا احسان نہیں تو اور کیا ہے؟ اسی طرح سائنس کی معلومات کا اندازہ اسی ادنیٰ سی بات سے کر لیجئے کہ ہم زیادہ سے زیادہ یہ تو جانتے تھے۔ کہ بم ایک قسم کا گولہ ہوتا ہے۔ جو پھٹنے کے بعد زمین کو دھنک کر رکھ دیتا ہے۔ مگر اس جنگ کی بدولت بموں کی مختلف قسموں، ان کی ساخت، ان کے اثر، ان کی خاصیت، ان کی ترکیب استعمال، ان کے نتائج وغیرہ کے متعلق ہم اس قدر واقف ہو چکے ہیں۔ کہ جس دیہات میں کہئے محض بم کے موضوع پر ایک گھنٹے تک بغیر کھنکھارے یا پانی پئے ہوئے تقریر کر دیں۔ اور تقریر کے بیچ میں ایک شعر بھی نہ پڑھیں۔

خیر اس قسم کے چھوٹے چھوٹے فوائد تو بے شمار پہنچے ہیں لیکن چند فوائد تو ایسے ہیں۔ کہ اگر اس جنگ کو رحمت کا درجہ دیا جائے تو کوئی تعجب نہ کیجئے۔ اب باور کیجئے کہ اس جنگ نے ہماری بعض ایسی خوبیوں کو آب حیات پلا کر زندہ کر دیا ہے۔ کہ ہم خود حیران ہیں۔ کہ ان خوبیوں کا اندازہ جنگ سے پہلے کیوں نہ ہوا تھا۔ مثلاً کفایت شعاری کو لے لیجئے۔ فضول خرچ بڑے بوڑھے ہمیشہ کفایت شعار

بننے کی نصیحت کرتے چلے آئے ہیں۔ ریڈروں میں کفایت شعاری کے متعلق پڑھے ہیں۔ نظمیں یاد کی ہیں۔ امتحان میں یہ سوال تک حل کیا ہے کہ "اپنے باپ کو ایک خط لکھو جس میں ڈھائی صفحے کے اندر کفایت شعاری کی خوبیاں ان کو سمجھاؤ۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود کفایت شعاری کو اپنا شعار نہ بنا سکے۔ لیکن اب ہماری ضرورتیں خود بخود محدود ہو گئی ہیں۔ وہ منہ جو ایک سا قیمتی صابن کے بغیر دھل ہی نہ سکتا تھا۔ اب ایک اوسط درجے کے صابن سے صاف ہو جاتا ہے۔ وہ سوٹ جو دس مرتبہ پہننے کے بعد بیکار ہو جاتا تھا اس میں خدا نے ایسی برکت دے دی ہے۔ کہ بیس مرتبہ سے زیادہ بھی پہنا جا سکتا ہے۔ وہ جوتا جو تین مہینے کے بعد اپنی شیپ بدل دیتا تھا۔ اب چھ مہینے کے بعد اپنی اصل رعنائی پر آتا ہے۔ وہ موٹر جو پٹرول کے سمندروں میں تیرا کرتے تھے اب بوقت ضرورت سڑکوں پر چلتے نظر آتے ہیں۔ اور بجائے پٹرول میں غوطے لگانے کے اب پٹرول کو نہایت حفاظت سے اپنے ٹینک میں محفوظ رکھتے ہیں۔ وہ کاغذ جو کار آمد کم اور ردی زیادہ ہوتا تھا۔ اب ردی کم اور کار آمد زیادہ ہوتا ہے۔ وہ غلہ جس کو کھانے کے کام میں برائے نام اور پھینکنے کے کام میں زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جاتا تھا۔ اب کلیجہ سے لگا کر رکھا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس طرح ہر چیز کی قدر و منزلت بڑھ گئی ہے۔ غیر ضروری باتیں جو ضرورت بنی ہوئی تھیں ختم ہو چکی ہیں۔ اور اب ضرورت ہی کا نام ضرورت ہے جنگ نے جس خوبصورتی سے کفایت شعاری کا یہ عملی درس دیا ہے۔ کاش وہ ہماری عادت اور فطرت بن جائے۔ اور ہم جنگ کے بعد بھی اسی پر عامل رہیں۔ اس وقت پتہ چلے گا۔ کہ یہ جنگ کتنا بڑا احسان کر گئی ہے۔

سودیشی تحریک ہی کو دیکھ لیجئے۔ ہمارے کیسے کیسے رہنماؤں نے سودیشی پرچار کیا ہے۔ تقریریں کی ہیں نظمیں پڑھی ہیں۔ کھدر بھنڈار کھولے ہیں۔ جلسے کئے ہیں جلوس نکالے ہیں۔ مگر سودیشی کی تحریک اس حد تک کبھی کامیاب نہ ہو سکی۔ جس قدر اس جنگ کے بدولت ہو رہی ہے۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ بدیشی بنیائن پر سودیشی قمیص پہن لی۔ بلکہ یوں کہیئے کہ بدیشی صابن سے غسل کر کے بدیشی تولئے سے جسم خشک کیا۔ پھر بدیشی تیل ڈال کر بدیشی کنگھے سے بال سنوارے۔ چہرے پر بدیشی اسنو لگائی۔ اور سب کے آخر میں سر پر ایک سودیشی ٹوپی پہن کر بدیشی سگار پیتے ہوئے باہر نکل گئے۔ جن کے دل میں سودیشی کا درد تھا۔ یہاں اُن کا سوال نہیں، مگر جو سودیشی بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ یا جن کو سودیشی بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ان کا تو تقریباً یہی حال تھا۔ لیکن اس جنگ نے ان کو بھی سودیشی بنا دیا ہے۔ اب وہ اپنی تمام ضرورتیں اسی طرح پوری کرتے ہیں۔ مگر سودیشی اشیاء سے اب ان کو پتہ چلا ہے کہ سودیشی چیزیں بھی ایسی زیادہ بری تو نہیں ہوتیں۔ بلکہ اگر استعمال کی جائیں تو اور بھی اچھی بن سکتی ہیں۔ یہاں اسی نکتے سے ایک اور نکتہ پیدا ہوتا ہے کہ جنگ سے پہلے ہندوستان میں صنعت کا وہ زور بھی نہ تھا۔ جو اس جنگ نے یکایک پیدا کر دیا ہے۔ اب تو اسی ہندوستان میں تقریباً وہ تمام چیزیں بننے لگی ہیں۔ جو پہلے باہر سے ہندوستان میں آتی تھیں۔ صرف بننے ہی نہیں لگی ہیں۔ بلکہ نہایت اچھی بننے لگی ہیں۔ جاپانی اشیاء کی طرح محض لوٹنے کے لئے ارزاں اور بودی نہیں۔ بلکہ اپنی ضروریات کے مطابق، ارزاں اور مضبوط بھی۔ پھر یہاں یہی کہنا پڑیگا۔ کہ ہندوستان کو جنگ نے صنعتی ملک بنا دیا ہے۔ تو خدا کرے جنگ کے بعد بھی

یہ صنعتی جوش باقی رہے - بہر حال ہندوستانیوں کو یہ اندازہ تو ہو ہی گیا ہے کہ اگر جاپان سے دیاسلائیاں نہ آئیں تو ہندوستان میں اندھیرا نہ رہے گا - بلکہ اب ہندوستان میں خود ایسی دیاسلائیاں بننے لگی ہیں - کہ وہ چاہے تو جاپان میں آگ لگا سکتا ہے ہندوستان کو اس جنگ نے جس سرعت کے ساتھ صنعتی ملک بنا دیا ہے - اس کا تصور بھی جنگ سے پہلے نہ ہو سکتا تھا - کپڑوں اور دوسری چیزوں کو تو جانے دیجئے - مشینیں تک ہندوستان میں اسطرح بن رہی ہیں - گویا اب تک ہندوستان محض خاکساری کی وجہ سے خاموش تھا - ورنہ اس میں خود لنکا شائر اور لیڈس گوشے گوشے میں موجود تھے - اگر ہندوستانی صنعتوں کا یہی حال ہے - تو جنگ کے بعد ہندوستان کو کسی باہر کی چیز کا قطعاً محتاج نہ ہونا چاہیئے - یہ تو ہندوستان کی محض ریاست تھی - کہ دوسرے اُس کی خدمت کرتے تھے - اور وہ مخدوم بنا بیٹھا تھا مگر اب تو یہ حال ہے کہ اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے علاوہ دوسرے مصروف اور صنعتی ملکوں کی طرح ہمارا ہندوستان بھی سپاہیوں کے لئے ضروری سامان تیار کر رہا ہے - سامانِ حرب بنا رہا ہے - فوجیوں کی ضرورت کی ہر چیز تیار کرنے میں مصروف ہے - ہندوستان میں پہلے جس قدر بیکار اور بے روزگار لوگ تھے وہ سب اب صناع اور کاریگر ہو چکے ہیں - ہندوستان پر یہ احسان کس کا ہے - ؟ کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ جنگ کا احسان نہیں ہے - ؟

ایک بات جس کو دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے - وطن کی محبت بھی ہے - جنگ سے پہلے یہی ہندوستان تھا اور یہی ہندوستانی ، مگر وطن کی پُر جوش محبت جو اس جنگ سے پیدا ہوئی ہے پہلے تاریخوں میں نظر آتی تھی -

مگر روزمرہ کی زندگی میں ڈھونڈھنے سے ملا کرتی۔ اور اب تو ہر زبان پر وطن، ہر
لب پر ہندوستان، ہمارا ہندوستان ہے غاصبوں کے بڑھتے ہوئے قدم ہندوستان
کی طرف اُٹھتے ہی تھے۔ کہ ہندوستان میں حب الوطنی انگڑائی لے کر صدیوں کی نیند سے
بیدار ہو گئی۔ تمام بیرونی اختلاف اس مرکز پر آکر ختم ہو گئے کہ کچھ بھی ہو بہر حال
ہندوستان ہندوستانیوں کا ہے یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ حکومت تو اب تک
غیروں ہی کی تھی۔ یہ جذبہ اب تک کیوں نہ بیدار ہوا۔ مگر دراصل یہ سوال اس لئے
پیدا نہیں ہوتا کہ غیر بھی مگر دوستی، اور حکومت کا فرق نمایاں نہیں ہوا تھا۔ سمجھ میں نہ
آتا تھا کہ یہ دوستی ہو رہی ہے یا حکومت، مگر اب تو یہ بات روشن ہو چکی تھی۔ کہ اگر
دشمنوں کے بڑھتے ہوئے قدم توڑ نہ دیئے گئے تو حکومت کے پردے میں دوستی یا
دوستی کی آڑ میں حکومت نہ ہوگی۔ بلکہ کھلم کھلا دشمنی کی حکومت ہوگی۔ اور دشمنوں کی
غلامی قبول کرنا پڑے گی جس کے بعد نہ ہندو ہندو رہے گا۔ نہ مسلمان مسلمان بھیا
اور تعزیئے کا جھگڑا ہوگا نہ اذان اور ناقوس کا: بلکہ سب غلام آقا کا کلمہ پڑھنے
پر مجبور ہوں گے۔ ان کی مسجدیں شہید ہوں گی۔ مندر ڈھا دیئے جائیں گے۔
اور دل کو بھی ڈھا دیا جائے گا۔ جو خدا کا مقام ہے۔ ان سب کی جگہ حکومت کی
زبردستی جو کلمہ پڑھوائے گی پڑھیں گے۔ جو عبادت کرائے گی کریں گے جس کے
خدا کھے گی کہنا پڑے گا۔ ہمارا ہندوستان جو اب تک اپنوں کی امانت میں ہے
غاصب غصب کر لیں گے۔ اور پھر ہم وطن چھوڑ کر غریب الوطن بھر میں رہ کر خانہ
بدوش اور اپنوں میں رہ کر بیگانے بن جانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ کہاں تک
وطن کی محبت جوش میں نہ آتی۔ وطن کے ہاتھ سے جانے کا خیال پیدا ہوا ہی تھا

کہ حب وطن نے تڑپا دیا۔ اور وہی ہندوستانی جن کو اس جذبے سے خالی سمجھا جاتا تھا۔ سچے محب وطن بن کر اس عزم بالجزم کے ساتھ کمر باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ کہ ہمارے جیتے جی ہمارا وطن کسی کا نہیں ہو سکتا۔ یہ بیداری جنگ نے نہیں تو کس نے پیدا کی۔؟ حب وطن کے مردہ جذبے کے ساتھ مسیحائی لڑائی نے نہیں تو کس نے کی۔؟

اور تو اور ہندوستان والوں کے متعلق یہ خیال راسخ ہو چکا تھا۔ کہ ان کے خون میں گرمی، ان کے بازوؤں میں قوت اور ان کی تلواروں میں آب سب ختم ہو چکی ہے۔ اور واقعی ہندوستانی اپنے اُس مشغلے کو چھوڑ چکے تھے۔ جو ان کے آبا کا کھیل تھا۔ نہ وہ شمشیر زنی تھی۔ نہ وہ پھٹالوں کی آن باقی تھی۔ نہ وہ راجپوتوں کی شان، سپاہیانہ تیوروں کی جگہ ایک مستقل بے حسی نے لے لی تھی۔ تلواروں سے کھیلنے والے کنکوے اڑا رہے تھے۔ ہارمونیم پر گا رہے تھے۔ تاش کھیل رہے تھے۔ اور ذرا سے دھماکے پر اس طرح اچھل پڑنے کے عادی ہو گئے تھے۔ کہ اُن کے متعلق سپاہیانہ تصور ہی ناممکن تھا۔ مگر وطن پر آنچ آتے ہوئے دیکھی۔ اپنی غیرت اور آبائی حمیت پر غیروں کی مسکراہٹیں دیکھیں، اور یکایک اُن ہی مُردوں میں زندگی کی وہ لہر دوڑ گئی کہ دھماکوں پر اچھل پڑنے والے سینہ تان کر گھروں سے نکل آئے۔ یہی کنکوے لڑانے والے۔ بٹیروں کی پالیاں منعقد کرنے والے، مشاعروں میں آداب، تسلیمات کرنے والے، اللہ آمین سے پروان چڑھنے والے، دھوپ میں کملانے والے، اور ناز و نعم میں پروان چڑھنے والے، سپاہیانہ تیوروں کے ساتھ میدان کی طرف بڑھے۔ اور معرکوں میں وہ دادِ شجاعت دی۔

کہ ہندوستان کا لوہا غیروں سے بھی منوالیا۔ جن کو بھیڑ سمجھا جارہا تھا وہ شیروں کے شیر نکلے۔ دشمنوں کو اپنی روایتی سپہ گری کے وہ جوہر دکھائے کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ اور کوئی تو کیا خود ہندوستانیوں کو بھی اپنے متعلق یہ خیال نہ ہوگا۔ کہاں ہیں اب تک یہ شجاعت باقی ہے۔ وہ اب تک زندہ ہیں اور اپنی آزادی اور اپنے وطن کی عزت کی لاج آج بھی اُن کو دشمنوں کے مقابلے میں بپھرے ہوئے شیر، گرجتے بادل، اور مشتعل طوفان کی صورت میں لاسکتی ہے۔ گہواروں میں جھولنے والے جوق در جوق مرکزوں کی طرف دوڑے، کوئی سپاہی بنا کوئی سپہ دار، کسی نے بری فوج میں شامل ہو کر اپنا فرض پورا کیا۔ کسی نے بحری فوج میں داخل ہو کر اپنا فرض پورا کیا۔ مختصر یہ کہ جہاں نیند کی چھاؤنی چھائی ہوئی تھی۔ وہیں فوجی نقل و حرکت نظر آنے لگی ہندوستانی اپنے اُس روایتی دور میں

بیوی کے رشتہ دار

شادی کے بعد سے اس بات پر غور کرنے کی کچھ عادت سی ہو گئی ہے۔ کہ شادی کرنا کوئی دانشمندانہ فعل ہے یا حماقت! یعنی اگر یہ دانشمندی ہے تو پھر بعض اوقات اپنے بے وقوف ہونے کا بے ساختہ احساس کیوں ہونے لگتا ہے۔ اور اگر یہ حماقت ہے تو اس حماقت میں دنیا کیوں مبتلا نظر آتی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں۔ کہ اگر یہ کوئی غور کرنے کی بات تھی تو شادی سے پہلے غور کیا ہوتا۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ غور کرنے کا شعور عام طور پر شادی کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ اس دنیا سے شادی کی رسم کب کی فنا ہو چکی ہوتی۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔

وہ یہ ہے کہ شادی ہو چکنے کے بعد اس پر غور کرنے سے فائدہ ہی کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا فائدہ ایک شادی شدہ انسان کو تو خیر نہیں پہونچ سکتا لیکن خلق اللہ کو فائدہ پہنچنے کا قوی امکان موجود ہے۔ جس طرح دنیا کے تمام تجربے حاصل کرنے والے بنی نوع انسان کے محسن ہیں۔ اسی طرح ہم شادی شدہ لوگ بھی آئندہ نسلوں کے محسن ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ نسلیں۔

ع دیکھیں ہمیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

یقیناً وہ عظیم المرتبت شخص ہم سب کا محسن تھا جس نے سب سے پہلے زہر کھا کر مرنے کا تجربہ حاصل کیا۔ اور دنیا کو زہر کے متعلق یہ شعور عطا کیا کہ اس کے کھانے سے آدمی مر جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی شادی اس لئے کی ہے کہ غیر شادی شدہ ہم کو دیکھیں کہ شادی کرنے کے بعد انسان وہ ہو جاتا ہے جو ہم ہو گئے ہیں۔

شادی تو خیر ایک مستقل بحث بلکہ ایک مکمل فن ہے۔ اس صحرا کا صرف ایک ذرہ اور اس قلزم کا صرف ایک قطرہ اس وقت موضوع بحث ہے۔ یعنی بیوی بھی نہیں بلکہ بیوی کے رشتہ دار، اب اگر آپ اسی ذرے کی وسعتوں اور اسی قطرہ کی گہرائیوں پر غور کریں تو چیخ اٹھیں گے۔

اسی قطرے میں دریا ہے اسی ذرے میں صحرا ہے (بیوی کے رشتہ دار ایک شادی شدہ انسان کے لئے عام طور پر سانپ کے منہ والی چھچھوندر ثابت ہوتے ہیں۔ جن کو نہ اگلا جائے نہ نگلا جائے۔) اگلا اس لئے نہیں جا سکتا کہ وہ بیوی کے رشتہ دار ہیں۔ اور نگلا اس لئے نہیں جا سکتا۔ کہ اپنے رشتہ دار نہیں ہیں۔ اپنے رشتہ داروں کے متعلق ایک آدمی کو ہر وقت اُگلنے یا نگلنے کا اختیار حاصل رہتا ہے۔ ان سے

دل خوش ہے، طبیعت میل کھا رہی ہے۔ دل قبول کر رہا ہے تو تعلقات قائم ہیں، ورنہ بہانہ ڈھونڈ کر الگ ہو گئے، وہ اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر خوش، لیکن بیوی کے رشتہ داروں کے متعلق تو یہ گویا ایک طے شدہ بات ہے کہ اُن سے ہر حال میں تعلقات رکھنا ہیں۔ اُن سے خلوص کا اظہار کرنا ہے۔ اُن کی ملاقات میں دل، جگر اور آنکھوں کے فرش بچھا کر اُن پر جذبات کے گاؤ تکئے لگانا ہیں۔ اگر وہ بڑے ہیں تو سعادت مندی کے اُن کو وہ جوہر دکھانا ہیں جو خود اُن کی ذاتی اولاد سے ممکن نہ ہوں۔ اگر برابر کے ہیں۔ تو محبت کا وہ اظہار کرنا ہے کہ وہ بھی منافقت کے قائل ہو جائیں۔ اگر چھوٹے ہیں۔ تو اس قسم کی شفقت کرنا ہے، جس میں گستاخی کا کوئی امکان نہ ہو۔ البتہ اگر ادب کا پہلو نمایاں ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس قسم کی زبردستی اور نفس کشی سے ایک انسان کس حد تک جرائم پیشہ ہو جاتا ہے یعنی اس کی اخلاقی جرأت فوت ہو جاتی ہے، ضمیر کی زبان پر فالج گر جاتا ہے، سچائی سکتہ کے عالم میں آ جاتی ہے۔ ایمانداری اختلاج میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اور بحیثیت مجموعی وہ انسان اگر کچھ باقی رہ جاتا ہے تو صرف منافق، دروغ باف، اور ایک حد تک ڈرپوک بھی لیکن کچھ بھی ہو اس کو اگر بیوی پیاری ہے تو بیوی کے رشتہ داروں سے اچھے تعلقات رکھنا ہی پڑتے ہیں۔ خواہ دل ہی دل میں وہ خودکشی یا فرار کے امکانات پر کتنا ہی غور کیوں نہ کرے۔

بیوی کے رشتہ داروں کی بھی عجیب عجیب قسموں سے ایک بیوی والے کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اُن میں سے موت کا درجہ تو کم دیتی سو بہ ہی کو حاصل ہوتا ہے لیکن بعض ہوتے ہیں کھفر سوت، بعض ناگہانی موت، بعض غریب الوطنی کی موت اور بعض ہر حال

ہیں ملک الموت۔ محض موت تو خاص خاص لوگ ہوتے ہیں جن کا ایک انسان تقریباً عادی ہو جاتا ہے۔ مثلاً بیوی کے والد، بھائی، ماں، خالہ، چچا، چچی، ماموں اور ممانی وغیرہ۔ ناگہانی موت وہ رشتہ دار ہوتے ہیں جن کا کوئی علم ہی نہیں ہوتا۔ بس دفتر سے آکر یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ باورچی خانہ میں مرغ مسلم پک رہا ہے۔ نعمت خانہ میں فیرینی کے پیالے چنے ہوئے ہیں۔ اور گھر کے تمام نوکر پلاؤ سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ خسر صاحب کے کوئی پھوپھی زاد بھائی جنوبی افریقہ سے تشریف لائے ہیں۔ چنانچہ صحن میں قالین بچھے ہوئے تخت پر گاؤ تکیے سے لگے ہوئے حقہ پیتے اور پان چباتے ایک سندباد جہازی نظر آتے ہیں۔ جن کے سامنے بیوی صاحبہ پان پر پان اور انگلیوں پر انگلیاں رکھتی نظر آتی ہیں۔ مجبوراً نہایت ادب سے آداب عرض کرنا پڑتا ہے جس کے جواب میں یہ فرعون مصر فرماتے ہیں۔

"سلامت رہو میاں، آؤ بیٹھو، بڑی طبیعت خوش ہوئی تمہیں دیکھ کر، مگر برخوردار من یہ عجیب طریقہ ہے تمہارے یہاں کا کہ صبح کے غائب اب آئے ہو شام کو۔"

عرض کیا کہ "دفتر کے اوقات کچھ ایسے ہی ہیں۔"

نہایت رعونت سے فرمایا۔ "دراصل ملازمت غلامی کا دوسرا نام ہے۔ ہمارے خاندان میں سب تجارت پیشہ ہیں۔ اب یہ ان لڑکیوں کی قسمت تھی کہ ان کو ملازمت پیشہ بر ملے۔ اور دراصل تجارت کا کہنا ہی کیا۔ انسان بادشاہی کی حد تک ترقی کر سکتا ہے۔ جنوبی افریقہ میں تمہاری دعا سے پہلے ایک چلتے

اسٹال تھا میرا، اب دو ہوٹل ہیں اور خوب چل رہے ہیں۔ بھائی صاحب کو دیکھو، یعنی اپنے خسر کو بیس بیل فیتہ وغیرہ بیچتے تھے۔ مگر اب خدا کے فضل سے محض دوکان کا کرایہ دیتے ہیں، آٹھ روپے ماہوار تو مطلب یہ کہ تجارت کچھ اور ہی چیز ہے۔ بہرحال کیا تنخواہ ملتی ہے۔"

عرض کیا: "پچاسی روپے"

نہایت حقارت سے ان بساطی کے بھائی ہوٹل والے صاحب نے فرمایا۔

"اس قدر تو آمدنی ایک تانگہ رکھ کر اور کرایہ پر چلا کر بھی ہو سکتی ہے۔" اب بیوی کو جو رحم طلب نظروں سے دیکھا تو وہ گویا اپنے افریقن چچا جان کی تائید میں تھیں نتیجہ یہ کہ زہر کا گھونٹ پی کر اور اُن کے ساتھ مرغ پلاؤ۔ اور فیرنی کھا کر رہ گئے۔

ایک تو آئے دن کی مصیبت یہ ہے کہ سوسائٹی میں ہر وقت کے طعنے ہیں۔ کہ سنئے جناب آپ کے خسر تو بڑے گراں فروش ہو گئے ہیں۔ سیب پائے گئے ٹین تمام دنیا میں چار آنہ درجن مل رہے ہیں۔ اور وہ دیتے ہیں۔ پانچ آنہ درجن۔ اب کون ان پڑھے لکھے دوستوں کو سمجھائے کہ بھائی ان کو گھما پھرا کر بساطی نہ کہو۔ ملک التجار کہو، بہرحال اس قسم کی باتوں کی تو خیر عادت پڑ جاتی ہے۔ مگر یہ بھانت بھانت کے کھانی رشتہ دار جو ٹپکتے رہتے ہیں۔ اُن کا آخر کیا علاج۔ اور ان سے بھی زیادہ لاعلاج وہ قسم ہے جس کو غریب الوطنی کی موت عرض کیا ہے۔ بیوی کے یہ رشتہ دار غربت میں بہت ستاتے ہیں۔ فرض کر لیجئے کہ آپ بسلسلۂ ملازمت یا بسلسلۂ شامت کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ بڑے لئے دیئے بیٹھے ہیں۔ دل مطمئن ہے

کہ یہاں کسی کو یہ خبر نہیں کہ ہم لبساطی کے داماد ہیں۔ کہ یکایک ایک صاحب داڑھی چڑھائے لٹھ ہاتھ میں لئے کچھ چودھروں کی سی وضع قطع تشریف لے آئیں گے۔ اور اتنی زور سے السلام علیکم کریں گے کہ آپ اچھل پڑیں۔ اب وہ گل افشانی شروع کر دیں گے۔ کہ ارے بھائی یہاں آئے اور خبر تک نہ کی۔ ہم لاکھ غریب ہیں، مگر پھر بھی تم ہمارے دل و جگر ہو۔ میں تمھارے خسر صاحب کی حقیقی خالہ کا داماد ہوں۔ اس قدر قریب کے عزیز اور یہ بیگانگی اور جو یہ کہو کہ میرا پتہ نہ تھا تو میاں یہ بات میں ماننے کا نہیں، اسٹیشن پر جس تانگہ والے سے پوچھ لیتے کہ بھائی تمھارے چودھری کہاں رہتے ہیں وہ پتہ بتا دیتا۔ اب بتایئے کہ ان چودھری صاحب کے پردیسی داماد کا سارا وقار اس غریب الوطنی میں کس کی نعلیں جھانکتا پھرے۔ اور جو سکہ یہاں جمانا چاہتے تھے۔ اس کی کھوٹ معلوم ہو جانے کے بعد اپنی قیمت کیوں کر قائم رکھی جائے۔

خیر یہ صورتیں تو ایسی حالت میں پیدا ہوتی ہیں کہ آدمی ضعف بصر کے ماتحت یا تو اپنے سے پست درجہ کے لوگوں سے سسرالی تعلقات پیدا کرے۔ یا زمانہ کی خرابی کے ماتحت یا بوجہ خود اپنی اصلیت چھپا رہا ہو۔ اور وہ اس طرح بے نقاب ہوتی ہے لیکن ایسی صورتیں اگر نہ بھی ہوں تو بھی سسرالی رشتہ دار کچھ عجیب خدائی فوجدار قسم کے لوگ تو ضرور ہی ثابت ہوتے ہیں۔ ہمدردی وہ اس لئے نہیں کر سکتے کہ اپنے نہیں ہوتے۔ اور رخنہ جتنی ڈالنے کے لئے اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کہ ہم ان کی ایک عزیزہ کے نہایت خاص قسم کے رشتہ دار ہوتے ہیں یعنی وہ اچھی طرح ٹھونک بجا کر اس قابل تو سمجھ لیتے ہیں۔ کہ اپنی عزیزہ کی شوہری کے

اعزاز سے ہم کو سرفراز کر دیں۔ مگر یہ اندیشہ ان کو قدم قدم پر رہتا ہے کہ ممکن ہے ان کی نظر انتخاب نے دھوکا کھایا ہو۔ بہر حال پہلے تو وہ رسمی طور پر اپنی عزیزہ کا شوہر بنا دیتے ہیں۔ اس کے بعد عملی طور پر گویا شوہر بننے کی ٹریننگ دیتے رہتے ہیں۔ شوہر غریب، نسبت سے لیکر شادی تک اور شادی سے لیکر موت تک یہی سمجھتا رہتا ہے کہ اس نے اپنے کو صرف ایک ہستی سے وابستہ کیا ہے۔ لیکن اس کی یہ غلط فہمی طرح طرح سے دور کی جاتی ہے۔ اور اس کو بتایا جاتا ہے کہ نکاح تو صرف ایک سے ہوا۔ مگر نباہ اُن سب سے کرنا ہے۔ جو کسی نہ کسی حیثیت سے بیوی کے رشتہ دار ہیں یا ہو سکتے ہیں یا سمجھے جا سکتے ہیں۔ یا سمجھے جانے کا کوئی بھی امکان موجود ہے۔ ان رشتہ داروں سے نباہ بھی مر کھپ کر گوارا کر لیا جائے مگر ہوتا عام طور پر یہ ہے کہ یہ نباہ اخلاقی، تمدنی، معاشرتی، اقتصادی اور معاشی ہر حیثیت سے اول تو نا ممکن ہوتا ہے۔ اور اگر ممکن بنا بھی لیا جائے تو بہت گراں رہتا ہے۔ مثلاً اخلاقی حیثیت سے یوں گراں ثابت ہوتا ہے کہ ان کی ہر بد اخلاقی کو سراہنا آخر کیوں کر ممکن ہے۔ تمدنی اور معاشرتی حیثیت سے یہ نباہ اس لئے گراں بیٹھتا ہے کہ اپنا تمدن اور اپنی معاشرت چھوڑ کر ان کے رنگ میں رنگ جانا اول تو ایک قسم کی زن مریدی ہے۔ دوسرے یہ بھی کوئی ضروری بات نہیں کہ وہ تمدن اور وہ معاشرت قابل قبول بھی ہو۔ فرض کر لیجئے کہ وہ لوگ پہلوان ہیں۔ اب بتایئے کہ ہم اپنی معاشرت میں ڈنٹر اور مگدر کیوں کر شامل کر سکتے ہیں۔ اقتصادی حیثیت کا پوچھنا ہی کیا۔ جتنی تقریبیں، شادیاں، کن چھیدن، دُودھ بڑھائی، مونچھوں کے کونڈے، منگنیاں، اور حد یہ ہے کہ موتیں ان سسرالی رشتہ داروں

مسافروں کے جھگڑے

یہ آج کل کا ذکر نہیں ہے۔ آج کل تو ویسے بھی جنگ کا زمانہ ہے۔ اگر
مسافر اپنے اوپر بھی یہی ماحول طاری رکھتے ہیں تو اُن کو حق بجانب سمجھنا چاہیئے۔
لیکن جنگ سے پہلے بھی ہم نے تو ہمیشہ کم سے کم ریل کے سفر میں یہی دیکھا ہے
کہ سفر شروع کرنے کا ارادہ کرتے ہی جنگجوئی کا جذبہ کچھ اس طرح اُبھر آتا
ہے کہ گویا یہ بھی ناشتہ دان کی قسم کی کوئی نہایت ہی ضروری چیز ہے۔ اخلاق اور
صلح جوئی، مروّت اور انسانیت کو گویا بستر میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔ اور با اخلاق
سے با اخلاق بھلے مانس سے بھلے مانس آدمی مسافر بننے کے بعد کچھ عجیب خرانٹ قسم کا

میں ہوتی ہیں۔ اتنی اپنے رشتہ داروں میں کبھی نہیں ہوتیں اس لئے کہ اپنے رشتہ دار تو گنے گنائے محدود ہوتے ہیں۔ مگر ان سسرالی رشتہ داروں کا تو کوئی شمار نہیں ہوتا۔ پھر یہ کہ ہر تقریب میں بیوی کا جانا اور شوہر کا اس سلسلہ میں مقروض ہونا برحق ہوتا ہے۔ تاکہ سسرال میں بات بنی رہے۔ خواہ مہاجن بات کا بتنگڑ بنالے۔ معاشی حیثیت کا ذکر ہم نے اس لئے کیا ہے کہ بہتیرے داماد قسم کے یتیم لوگ یا تو سسرالی پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔ یا کم سے کم سسرالی بزرگوں کے مشورے سے کسی ملازمت سے مستعفی ہونے یا کسی ملازمت کی امیدواری کرنے کا فیصلہ ضرور کرتے ہیں۔ ان تمام امور کے علاوہ ایک سب سے بڑی بات یہ بھی ہوتی ہے۔ کہ سسرالی رشتہ داروں کی تبلیغ سے اپنے رشتہ داروں سے آدمی دور ہو جاتا ہے۔ خیریت اسی کو سمجھیئے کہ امن و سکون سے یہ تعلق ختم اور وہ استوار ہوتا رہے۔ ورنہ اس سلسلہ میں فوجداریاں تک دیکھی اور سنی ہیں اور کیا عجب ہے کہ بھی ان ہی فوجداریوں کی ذاتی طور پر نوبت آجائے۔ اس لئے کہ لاکھ سمجھدار سہی مگر پھر بھی آخر شادی شدہ تو ہم ہیں ہی۔ !

کا خود غرض جنگجو بن کر رہ جاتا ہے۔ لڑائی عام طور پر جگہ حاصل کرنے کے لئے لڑی جاتی ہے۔ اس لئے کہ ٹرین کے آتے ہی ہر درجہ کے دروازہ پر ایک ایک بہادر سپہ سالار قسم کا مسافر ناکہ بندی کی غرض سے اس لئے تعینات کر دیا جاتا ہے کہ نئے مسافروں کو سرحد پار یعنی اس درجہ میں نہ آنے دو۔ چنانچہ وہ بہادر اپنا پورا زور لگا کر "جگہ نہیں ہے، پیچھے سارے ڈبے خالی ہیں۔ یہاں نئے ڈبے لگیں گے۔ آگے جاؤ، یہ ریزرو ہے۔" قسم قسم کے موقع اور بے موقع نعرے بلند کرتا رہتا ہے۔ اور اپنے درجہ کے دروازہ پر جان کی بازی لگائے ہوئے ڈٹا رہتا ہے۔ نئے مسافروں میں سے بہت سے جاپانی قسم کے مسافر تو خیر ٹل جاتے ہیں۔ مگر جن مسافروں کے مقابلہ میں یہ حضرت خود جاپانی ثابت ہوتے ہیں۔ وہ ان کے رُخِ روشن پر اپنا ہولڈال رسید کر کے۔ سوٹ کیس کو خود ان ہی پر لادتے ہوئے اس بُری طرح اس سورچے کو توڑ دیتے ہیں۔ کہ باقی مسافروں کو بھی اپنی عافیت خطرے میں نظر آتی ہے۔ چنانچہ کوئی تو اپنی ٹانگیں پھیلا لیتا ہے۔ کوئی طوطے کا پنجرہ نیچے سے اٹھا کر سیٹ پر رکھ دیتا ہے۔ کوئی کسی بچے کو لمبا لمبا لٹا دیتا ہے مختصر یہ کہ اس قسم کی تمام ترکیبوں پر عمل کیا جاتا ہے جن سے یہ خود لیٹ بھی سکیں۔ اور اپنی سیٹ کو دوسری دولت خانہ نما ضرورتوں میں بھی لا سکیں۔ اور نئے آنے والے مسافروں کو اس فاتحانہ داخلہ کے بعد بھی یا تو کھڑے کھڑے سفر کرنا پڑے یا وہ خود اپنے اسباب کے ساتھ اسباب بن کر بیٹھے۔ چنانچہ جب یہ اپنے لئے جگہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ تو عجیب عجیب عذر فی البدیہہ تراشے جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ بچہ سو رہا ہے اُدھر چلے جائیے۔ کوئی کہتا ہے ٹانگ میں درد ہے وہ دبی رہنے لگا۔ کوئی زنانی سواری کے قریب بیٹھنے پر معترض ہے۔ گویا زنانے

درجے کے علاوہ ہر مردانہ درجہ کے لئے زنانہ سیٹوں یا مجالس قانون ساز کی طرح زنانہ نشستوں کے تحفظ پر زور دیا جاتا ہے۔ کوئی بخار کا عذر کرتا ہے۔ کوئی اپنے اسباب کو کلیجے سے لگائے رکھنے پر مُصر ہوتا ہے۔ نتیجہ اس کا وہی ہوتا ہے جس کو لڑائی کہا جاسکتا ہے۔ نیا مسافر جو اتنا بڑا مورچہ توڑ کر اس درجہ میں داخل ہوا ہے۔ وہ ظاہر ہے کہ دب کر تو رہ نہیں سکتا۔ زبانی جمع خرچ کے بعد وہ کسی کا بستر الٹتا ہے کسی کا بکس چھین کر نیچے رکھتا ہے۔ کسی کو پیر سکیڑنے پر مجبور کرتا ہے اور آخر تو تو، میں میں گالم گلوچ وغیرہ ریل کی چھک چھک کے سروں سے مل کر کچھ عجیب رزمیہ نغمہ بن کر اس درجہ میں گونج جاتی ہے۔ مگر لطف یہ کہ جس طرح ریل کی دوستی ناقابلِ اعتبار ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ لڑائی بھی بہت کم پائیدار ثابت ہوتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ ہی حضرت خود کسی کو پان کھلا کر یا کسی او کی پیش کی ہوئی بیڑی یا سگریٹ قبول کر کے۔ اس درجہ کے لئے ملکی بن جاتے ہیں۔ اور اگلے تمام سٹیشنوں پر پیش آنے والے معرکوں میں ان کی سپاہیانہ اور سرفروشانہ خدمات باقی تمام مسافروں کے دل میں ان کے لئے ایک جگہ پیدا کر دیتی ہیں۔ آخر یہی دل میں پیدا ہونے والی جگہ ان کے لئے سونے کی جگہ بن جاتی ہے۔

اس قسم کی اکثر لڑائیوں کا تقریباً سب ہی کو تجربہ ہوگا۔ چنانچہ ہم خود بھی تجربہ کار ہیں۔ مگر ہم نے ان لڑائیوں کے لئے کچھ اور ہی قسم کا نقشہ جنگ بنا رکھا ہے جواب تک تو ہمیشہ کامیاب ہوا ہے۔ آئندہ کی خبر نہیں بات یہ ہے کہ تحفے کے مارے کا جسم ہے بس وہی سمجھیے اگر لڑائی لڑنے کا ارادہ بھی کریں۔ تو فریق مخالف کو ہنسی آجائے۔ اور اگر وہ اس ارادے کا جواب اس سے دیدے تو لینے کے دینے

پڑھائیں۔ لہذا ہماری لڑائی ذرا مختلف قسم کی ہوتی ہے جو تھوڑی بہت ....
GORILLA WAR کے اصول سے ملتی جلتی ہے چنانچہ ایک مرتبہ
دہلی سے لکھنؤ جا رہے تھے۔ کہ اسٹیشن پر یہی معرکہ درپیش ہوگیا ہماری ٹرین بین انٹر
کے تین ہی ڈبے اور ہر ایک کے دروازے پر نہایت سخت قسم کا مورچہ قائم جنگ
ناممکن اور سفر ناگزیر۔ آخر ہم نے ایک مورچہ کے کمانڈر صاحب سے جو بڑے
سورما نظر آتے تھے کہا۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

نہایت بھیگی بلی بن کر عرض کیا "بس ایک اسٹیشن جانا ہے۔ میں کھڑا رہوں گا"
ان حضرت نے ہم کو سر سے پیر تک دیکھ کر غالباً شریف اور ساتھ ہی یتیم
سمجھ کر کہا "آجائیے صاحب عجیب مصیبت ہے۔ جگہ ہے نہیں اور سفر سب کے
ہلے ہیں"

ہم نے درجہ میں داخل ہوتے ہوئے عرض کیا۔ میرا سفر تو نہایت ہی قلیل
قدر ہے۔ اس پر کچھ مسافروں کو ہنسی سی آئی تو ہم کو اپنے مجرمانہ ارادے میں کچھ
تقویت سی محسوس ہونے لگی۔ مگر نہایت سعادت مندی کے ساتھ حسب وعدہ
دست بستہ کھڑے رہے۔ خدا خدا کر کے ٹرین روانہ ہوئی۔ اب جگہ نہ ہونے کی
تفصیل ذرا سن لیجئے۔ ان کمانڈر صاحب کا موٹا سا بستر ایک سیٹ پر پھیلا ہوا تھا
جس پہ وہ آرام فرمانے والے تھے۔ اوپر کے ایک پورے برتھ پر ان کا سامان آرام
کر رہا تھا۔ باقی مسافروں کے بستر لگے ہوئے تھے۔ اور سب سونے کی نیت
باندھ کر بستر کھول چکے تھے۔ صرف دو ایک مسافر بیٹھے تھے جن کا ارادہ محض

اونگھنے لگا تھا۔ ٹرین کے روانہ ہونے کے بعد وہ ناگوار صاحب تفصیلی طور پر مطمئن ہونے کے لئے غسل خانہ کی طرف روانہ ہوئے تو ہم نے ایک مسافر سے کہا "یہ صاحب تو بہت زبردست معلوم ہوتے ہیں"

وہ بیچارہ غالباً ان ہی کا ستایا ہوا بیٹھا تھا کہنے لگا "بس کچھ پوچھئے نہیں، ایک ٹکٹ خرید کر گویا ہم سب کو غلامی میں خرید لیا ہے۔" اس پر تقریباً تمام مسافر ہنس پڑے تو ہم نے کہا "اچھا اب ذرا تماشہ دیکھئے گا" یہ کہہ کر جوتا کھولا، شیروانی اتاری اور ان ہی کے بستر پر لیٹ کر ان ہی کا کمبل اوڑھ لیا۔ اور آرام سے لیٹ گئے۔ اب باقی مسافر اٹھ اٹھ کر ہم کو دیکھ رہے تھے۔ اور اس دلچسپ تماشہ سے پہلے ہی جواب ہونے والا تھا ہنس رہے تھے۔ کہ یکایک پردہ اٹھا یعنی غسل خانہ کا دروازہ کھلا اور کمانڈر صاحب باہر نکل کر چونک ہی تو پڑے "یہ کیا۔" "؟ میں پوچھتا ہوں یہ کیا حرکت ہے؟" ہماری طرف سے کوئی جواب نہ تھا۔ ع یاں ایک خامشی ترے سب کے جواب میں

اور وہاں لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں اس طرح جاری تھے۔ کہ لب بھی ساتھ ساتھ دینے سے عاجز تھے۔ غصہ کے مارے ہکلائے جاتے تھے۔ دوسرے مسافروں سے جو اس زبردستی کا ذکر کرتے تھے وہ ہنس دیتے تھے۔ آخر انھوں نے غصہ سے کہا "ہٹئے" ہوجی یا میں پکڑ کر الٹ دوں بستر"

ہم نے نہایت اطمینان کے ساتھ کہا "نیچے کچھ کیچڑ سی ہے۔ بستر خراب ہو جائے گا۔"

کہنے لگے "صاحب یہ اچھی زبردستی ہے اور عجیب چیز ہیں آپ" "ارے

بھائی جان یہ میرا بستر ہے۔"

ہم نے اپنے بندھے ہوئے بستر کی طرف اشارہ کر کے کہا "میرا بستر وہ ہے۔"

کہنے لگے "پھر آپ پرائے بستر پر کیوں لیٹ گئے یہ بھی کوئی بات ہے!"

ہم نے نہایت محبت سے کہا "اس میں اپنے پرائے کی کیا بات ہے۔ آپ شوق سے میرے بستر پر لیٹ جائیے۔"

غصہ سے کانپ کر کہنے لگے "یہ تو اچھی زبردستی ہے۔ تشریف لے جائیے۔ اپنے بستر پر، بستر موجود ہے۔ تو اس کو کھولئے نا۔"

ہم نے کہا "کہاں کھولیں جناب کچھ آپ ہی مشورہ دیں۔"

بدتمیزی کے ساتھ بولے "ہم کیا جانیں جی!"

ہم نے تمیز داری کے ساتھ عرض کیا۔ "آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔"

ایک اور مسافر بول اٹھا "واقعی بتائیے نا وہ اپنا بستر کہاں کھولیں۔"

ان صاحب نے اُن کی طرف پلٹتے ہوئے کہا "یہ شرافت ہے ان کی، میں برابر طرح دے رہا ہوں۔ آخر اٹھ کر اوپر کی سیٹ سے سامان کیوں نہیں ہٹاتے، میرے بستر پر کیوں قبضہ کر رکھا ہے۔"

ہم نے کہا "اب کیوں مجھے سردی میں اٹھوائیے گا۔ جہاں اتنی عنایت کی وہاں اپنا سامان خود ہی اتار لیجئے نا۔ بات یہ ہے کہ وہ جو مشہور ہے تصنیف را مصنف۔ جی ہاں۔"

جلبلائے ہوئے کچھ ناقابلِ نشر باتیں کہتے رہے اور سامان اُتارتے رہے

جب وہ تمام سامان اُتار چکے تو ہم نے اُن کا بستر چھوڑتے ہوئے عرض کیا۔

"شکریہ" !!

باقی مسافر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اور ہم نے اپنا بستر لگا لیا۔ دوسرے بیٹھے ہوئے مسافر کو بھی لیٹے ہوئے مسافروں نے تھوڑی بہت جگہ دیدی۔ اور ہماری یہ جنگ اس خوشگوار انجام پر ختم ہوگئی۔

مگر ہائے وصل بلگرامی مرحوم وہ اس فن کے یگانۂ روزگار استاد تھے۔ ان کے ساتھ سفر کرنا بجائے خود ایک ایسا کارنامہ ہوا کرتا تھا گویا کوئی سپاہی یہ کہنے کا فخر حاصل کرے کہ ہم نپولین کے ساتھ شریک جنگ رہ چکے ہیں۔ تو جناب ہم بھی فخر سے کہتے ہیں۔ کہ وصل مرحوم کے شریکِ سفر رہے ہیں۔ اور اُن کے اس آرٹ کے ایسے ایسے نمونے دیکھے ہیں۔ کہ جن کو سُن کر سوائے افسانے کے اور کچھ نہ سمجھتے، ایک سفر درپیش ہے۔ اسٹیشن پر وصل صاحب کے ہمراہ آکر معلوم ہوا کہ ٹرین میں کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ اژدہام کو دیکھ کر دم الجھنے لگا۔ ہم سب نے وصل صاحب کو بھی رائے دی کہ دوسری ٹرین سے چلیئے گا۔ اس پر سخت تکلیف ہوگی۔ نہایت اطمینان سے بولے "بس صرف کسی ڈبہ میں داخل ہو جاؤ۔ اس کے بعد جگہ میں نکال لوں گا۔ میں پاگل ہوں، کیا سمجھے میں پاگل ہوں۔" ہم سمجھ گئے کہ کیا ارشاد ہو رہا ہے۔ سارا ہارٹ سمجھ میں آگیا۔ اور سامان اٹھا کر مرتے کھپتے ایک درجہ میں گھس ہی کر پہنچ گئے۔ اور ایک سیٹ پر بمشکل تمام وصل صاحب کو بٹھا کر ہم میں سے ایک آدھ دان کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور وہ وحشیانہ صورت بنائے گویا خود اپنے سے بھی بے خبر بیٹھے رہے شروع میں تو لوگ اُن کی طرف متوجہ نہ ہوئے مگر جب ٹرین چلی۔ اور وصل صاحب

نے ہم لوگوں کی گرفت سے اپنے کو چھڑانے کی کوشش شروع کی۔ اس وقت سب نے ان کو دیکھا۔ سُرخ چہرہ، منتشر داڑھی پھٹی پھٹی آنکھیں، کف در دہان۔ کون تھا جو پاگل نہ سمجھتا۔ اس پر آپ کے نعرے "دشمن سب دشمن"! پھر کچھ قہقہے۔ کچھ رونا کچھ گانا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ جھٹکا دے کر جو ہاتھ چھڑاتے ہیں۔ تو ایک مسافر کا ٹکھالے کر باہر پھینک دیا۔ اور جھپٹے دوسرے مسافر پر۔

ہم لوگ بیچ میں آگئے۔ ان کا ایک آدھ ہاتھ ہم میں سے کسی پر پڑ گیا۔ مگر وہاں اب مسافر دلے سمٹنا، بستر باندھنا، بچوں کو بچانا اور خود دور ہونا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ دو سیٹیں تو فوراً ہی خالی ہو گئیں۔ جن میں سے ایک پر وصل صاحب کو لٹا کر ہم لوگ گویا نگرانی کرنے لگے۔ اور جب وہ ذرا سکون پر آئے تو ہم میں سے ایک نے باقی مسافروں سے معافی مانگتے ہوئے کہہ دیا!

"کیا کہیں صاحب قسمت میں یہی لکھا تھا۔ اس بڑھاپے میں یکایک یہ حالت ہو گئی۔ اب تک گھر میں رکھا تھا۔ مگر اب مجبوراً پاگل خانے لے جا رہے ہیں۔ کل ایک صاحب کا سر پھوڑ دیا۔ پرسوں ایک بچے کو اٹھا کر دے مارا۔ ابھی لیٹے ہیں۔ ابھی اٹھ کر خدا جانے کیا کریں گے وصل صاحب نے یکایک انگڑائی لے کر "دشمن" کا نعرہ بلند کیا۔ اور سب مسافر سہم کر رہ گئے۔ اگلے اسٹیشن پر جس کثرت سے ہمارے ڈبہ سے لوگ اترے ہیں۔ شاید ہی کسی ڈبے سے اترے ہوں۔ جگہ ہی جگہ تھی اب۔ مگر اس قسم کا آرٹ ہر ایک کے بس میں تو ہوتا نہیں۔ نتیجہ یہ کہ عام طور پر اسی سلسلہ میں لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اور چلتی ہوئی ٹرین ایک رواں دواں میدان جنگ ہوا کرتی ہے۔

مگر آہ! اب کہاں سے وصل صاحب کو لایا جائے۔ اور کیوں کر ان کے ساتھ

سفر کیا جائے۔ حالانکہ اس زمانہ سے زیادہ ان کی ضرورت کبھی بھی نہ تھی۔ ممکن تھا کہ
خود حکومت ان کو سفر کم کروالی تحریک کے لئے استعمال کرتی۔ اور ہر پراپیگنڈے
سے زیادہ وہ بنفس نفیس اس تحریک کے لئے مفید ثابت ہوتے۔

خواہ مخواہ کی لڑائی!

خواہ مخواہ کی لڑائی دراصل لڑائی کی کوئی قسم نہیں بلکہ اگر سچ پوچھئے تو لڑائی کی فطرت ہے دنیا بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی لڑائی کی گہرائی میں پہونچ کر اگر آپ محققانہ نظر ڈالیں تو جڑ ہمیشہ خواہ مخواہ کو پائیں گے۔ دراصل خالص قسم کی لڑائی ہمیشہ خواہ مخواہ سے شروع ہوتی ہے۔ ورنہ جو لڑائیاں کسی وجہ کی بنا پر لڑی جاتی ہیں۔ ان کو اصولاً لڑائی کہنا ہی غلط ہے۔ ان کو انتقام، انتظام، تبادلۂ خیال۔ بیت بازی۔ مباحثہ یا زیادہ سے زیادہ مقابلہ کہا جا سکتا ہے مگر لڑائی تو اس وجدانِ آتشیں کو کہتے ہیں جس کی نہ کوئی وجہ ہو نہ کوئی سبب،

بس اتنا ہی کافی ہے کہ آؤ پڑوسن لڑیں۔ ساس نے کہا لڑے میری بلا۔ چیخ کر جواب دیا بلا لگے تیرے سگے سوتیلوں کو۔ اور لیجئے لڑائی شروع ہوگئی۔ اس لڑائی میں تو بگاڑ، اس کے بعد گالم گلوچ۔ پھر کنکر پتھر، اس کے بعد لپاڈگی، دھینگا مشتی۔ اور آخر میں خون خرابے تک نوبت پہنچ سکتی ہے۔ جیسی بھی خدا لڑنے والوں کو توفیق دے۔ مختصر یہ کہ بعد میں تھانہ اور عدالت سب ہی کچھ ہوگا۔ مگر اس لفظ "خواہ مخواہ" کا کوئی کبھی شکریہ ادا نہ کرے گا جس کے بدولت ایسی رونق نصیب ہو سکی۔

ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ لڑائی کا مزہ بھی خواہ مخواہ کی لڑائی میں ہے۔ یعنی لڑنے کا وہم و گمان بھی نہیں ہے۔ بلکہ دو لڑنے والوں کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھ کر عبرت حاصل کر رہے ہیں۔ کہ لاحول ولا قوۃ یہ بھی کوئی انسانیت ہے کہ سرِ راہ بے بات کی بات پر یہ دونوں ہنگامہ برپا کئے ہوئے ہیں۔ نہ باپ دادا کی عزت کا خیال نہ اپنے سفید پوش ہونے کا ہوش۔ کتنی شرم کی بات ہے اپنے قریب ہی ایک اور صاحب کو اسی طرح عبرت حاصل کرتے ہوئے دیکھا تو ان سے کہہ دیا۔ "رونا آتا ہے اس ناسمجھی پر۔ ارے صاحب اگر اس بے چارے نے یہ کہہ دیا کہ تمہاری پان کی پیک سے میرا پتلون خراب ہوگیا۔ تو اس میں آخر ایسے لڑنے کی کونسی بات تھی۔

ان صاحب نے گرج کر ہم پر برستے ہوئے کہا۔

"جی ہاں کوئی بات ہی نہ تھی، پتلون پہن کر تم لوگ زمین پر قدم ہی کیوں رکھتے ہو۔ آسمان پر چلا کرو نا، حیرت سے ہم نے ان حضرت کو دیکھ کر کہا۔ معاف کیجئے گا میرا مطلب تو یہ تھا کہ "بات کاٹ کر بولے۔ اجی نہیں رہنے بھی دو، چلے ہیں وہاں سے مطلب لے کر، کالے منہ پر پتلون پہن کر سمجھ بیٹھے ہیں کہ

جیسے ولایتی ہی تو ہو گئے"۔ ہم نے جان بچانے کے لئے کہا: "تو جناب مجھ پر غصہ کیوں اتار رہے ہیں"۔ وہ ایکدم مشتعل ہو کر بولے۔ "غصہ اتار رہا ہوں یا طرح دے رہا ہوں تم کو"۔ اور ہم سمجھ گئے کہ یہ واقعی غصہ کا مصرعہ طرح دے رہے ہیں تاکہ ہم بھی طبع آزمائی شروع کر دیں۔ لہٰذا ہم نے ان کے منہ نہ لگتے ہوئے ایک اور صاحب سے کہدیا۔ کہ "ذرا ملاحظہ فرمایئے آپ کی تیزی"۔ یہ سننا تھا کہ وہی صاحب جو آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے ایکدم آستینیں چڑھا کر سامنے ہی تو آ گئے۔ "تیزی..... تیزی۔ کہو تو دکھا دوں۔ یہ سارا طمع یہیں اتار کر نہ رکھ دیا ہو تو نام بدل دینا۔ ڈھائی آنے گز کی مارکین کا پتلون کیا پہن لیا ہے کہ اوقات ہی بھول گئے"۔ اب آخر کہاں تک ضبط کرتے جوش میں کہہ بیٹھے۔ کہ "زبان سنبھال کر بات کرو جی"۔ وہ صاحب گویا منتظر ہی تھے۔ زبان تو خیر سنبھال لی۔ مگر خود کو نہ سنبھال سکے اور جھپٹے اس طرح کہ گویا مار ہی تو ڈالیں گے۔ مگر خدا بھلا کرے بیچ بچاؤ کرنے والوں کا۔ کچھ ان کو پکڑ کر لے گئے۔ کچھ ہم کو چمکاتے ہوئے آگے بڑھے کہ "بابو جی آپ ہی غم کھایئے"۔ جو لڑائی پہلے سے ہو رہی تھی۔ اس کا خدا جانے کیا نتیجہ ہوا۔ مگر یہ خواہ مخواہ کی لڑائی خواہ مخواہ شروع ہو کر خواہ مخواہ ہی ختم ہو گئی۔ بہرحال اس وقت نہ سہی مگر اب اس لڑائی کے متعلق جتنا غور کرتے ہیں۔ اسی قدر طبیعت خوش ہوتی ہے کہ ہاں یہ تھی خالص لڑائی جو دو بے لوث لڑنے والوں کے درمیان کسی مقصد یا کسی غرض سے نہیں ہوئی۔ بلکہ لڑائی کے آرٹ کی خدمت کے طور پر ہم دونوں لڑے۔ مگر افسوس ہے کہ دنیا سے ہماری یہ خدمت نہ دیکھی جا سکی۔ اور لوگوں نے بیچ

بچاؤ کرو دیا۔ ورنہ ہم دونوں میں سے ایک فن کی اس بے لوث خدمت میں مر کر لڑائی کی تاریخ میں زندہ رہ جاتا۔ اور آنے والی نسلیں اس شہید فن کا نام عزت اور احترام سے لیتیں۔

خواہ مخواہ کی لڑائی کا تھوڑا بہت تجربہ تو خیر سب کو ہوگا۔ مگر ہم نے اس فن میں خاص طور پر ریاض کیا ہے۔ بہت سی خواہ مخواہ کی لڑائیاں لڑے ہیں۔ المکلف الخدمت کی حیثیت سے اور کبھی کسی اور کی دعوت پر مہمان بن کر یعنی خواہ مخواہ کی لڑائیوں میں الجھے بھی ہیں اور دوسروں کو الجھایا بھی ہے۔ لیکن ہمارا ذاتی تجربہ یہ ہے۔ کہ خواہ مخواہ کی لڑائی میں ناگہانی طور پر الجھ جانے میں جو لطف آتا ہے وہ کسی اور کو الجھانے میں نہیں آتا۔ ان دونوں میں آمد اور آورد کا فرق تو خیر ہے ہی لیکن اس کے علاوہ بھی الجھ جانے میں چونکہ کوئی ارادہ نہیں ہوتا، نہ کوئی تیاری ہوتی ہے۔ لہذا یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے چھپر پھاڑ کر لڑائی کی دولت سے بالکل اچانک طریقہ پر مالا مال کر دیا ہے۔ الجھانے میں یہ بات نہیں ہے۔ اس میں تو اپنی طرف سے ارادہ کیا معنی ایک قسم کا یقین سا ہوتا ہے کہ لڑیں گے اور لڑ کر رہیں گے اس موقع پر رہ رہ کر دعوت کی تشبیہہ ذہن میں آ رہی ہے۔ کہ دعوت کرنے والے کو زیادہ لطف نہیں آتا۔ بلکہ دعوت میں حصہ لینے والے کو لطف آتا ہے۔

بہر حال چونکہ یہ ایک فنی بحث ہے۔ لہذا ایک فن کار کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم تصویر کے دونوں رخ پیش کر دیں۔ اور اس فن کے طالب علموں کے فائدے کے لئے اپنے دونوں قسم کے تجربات پیش کریں۔

خواہ مخواہ کی لڑائی میں ناگہانی طور پر الجھ جانے کی سب سے بہتر مثال جو

اس وقت یاد آرہی ہے وہ یہ ہے کہ لکھنؤ سے بریلی جانا تھا۔ دماغ کے علاج کے لئے
نہیں۔ بلکہ مشاعرے میں پاگل بننے۔ راستہ نہایت سکون کے ساتھ طے ہو رہا تھا۔
ہمارے شرکائے سفر میں سے ایک صاحب بڑا لٹھ لئے۔ داڑھی میں مانگ نکالے
سر پر صافہ کے بجائے تقریباً پورا بستر لپیٹے اس انداز سے اکڑے ہوئے بیٹھے تھے
کہ گویا راجپوتانہ کا کوئی پایۂ تخت رکھا ہوا ہے۔ ریل کی ایک سیٹ پر آپ کے
ساتھ دو خواتین بھی تھیں۔ ایک نوعمر لڑکی اور دوسری غالباً اس لڑکی کی ماں
دونوں ہاتھ بھر کے گھونگٹ نکالے اور سر سے پیر تک زیور میں لدی ہوئیں۔ کہ
ناگاہ لڑکی نے ان صاحب سے کچھ کہنا چاہا۔ آپ نے نہ سنا۔ اس نے پھر مخاطب
کیا۔ آپ بے خبر رہے۔ اُس نے ہاتھ سے متعدد مرتبہ اشارہ کیا۔ مگر آپ متوجہ
نہ ہوئے تو ہم نے نہایت سادگی سے عرض کیا۔ "دیکھئے صاحبزادی کچھ کہہ رہی
ہیں۔" ان صاحب نے سانپ کی طرح پھنکار کر کہا۔ "کیا بکتے ہو جی۔ یہ
صاحبزادی ہے یا بیوی ہے میری۔" ہم ہکا بکا رہ گئے۔ اور پھر اُن صاحب کی
غلط فہمی دور کرنے کے لئے کہا۔ آپ کی بیوی تو چپ بیٹھی ہیں۔ صاحبزادی ہی کچھ
کہہ رہی ہیں۔" ایک دم بھڑک کر آگ بگولہ ہو گئے۔ "خبردار جو اب زبان سے
کچھ نکالا۔ میں مرنے مارنے سے نہیں ڈرتا ہوں۔ سمجھے کہ نہیں میری ساس
کو میری بیوی اور بیوی کو لڑکی کہے چلے جا رہے ہو۔ ان گالیوں کا جواب میرے
پاس بھی ہے۔ ابھی یہیں ڈھیر کر دوں گا۔" ہم نے فوراً معاملہ کی نزاکت کو سمجھ
لیا۔ اور ان سے معذرت خواہ ہوتے ہوئے عرض کیا۔ "معاف کیجئے گا میں
نے بالکل مذاق کے طور پر یا آپ کو ستانے کے لئے نہیں کہا تھا۔ بلکہ میں سمجھا

ہی غلط تھا۔" بدستور آتش فشاں کی طرح آگ برساتے ہوئے بولے "اچھا آپ نے غلط سمجھا تھا۔ کسی کو گالی دیدی صاحب اور کہنے لگے غلط سمجھا تھا۔ اب کہو تو میں سمجھا دوں تم کو غلط سمجھنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے" کچھ اور مسافر اس طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ ایک صاحب نے انگریزی میں ہم کو سمجھایا اور دو تین مسافروں نے اُن کی لگام تھامی بہر حال جو کچھ بھی ہو خواہ مخواہ کی لڑائی کی کتنی لاجواب مثال ملی ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ اس طرح ناگہانی طور پر اپنے کو لڑائی میں گھرا ہوا پاکر کس کو حیرت نہ ہوگی۔ دراصل اس قسم کے موقعوں پر سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ کہ لڑائی کے داعی کو کس طرح سمجھایا جائے۔ کہ بھائی ہم لڑنا بالکل نہیں چاہتے۔ اور آپ لاکھ سمجھائیں تو بھی وہ اپنے اخلاق سے مجبور ہو کر آپ کو اس دعوت شرکت پر مجبور کر ہی دیتا ہے۔

اب رہ گیا ہے الجھنا اُس کے متعلق ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ کہ وہ دراصل نتیجہ ہوتا ہے کسی اور غصہ کا، یعنی جب انسان کا بس دھوبی سے نہیں چلتا تو وہ گدھوں کی تلاش میں نکلتا ہے۔ کہ ان کے کان مروڑے مثلاً دفتر میں صاحب نے کسی بات پر جھاڑ ڈالی، افسر سے ماتحت کیا کہہ سکتا ہے۔ خون کے گھونٹ پی کر رہ جائے گا۔ مگر ترکی بہ ترکی جواب دینے کا وہ جذبہ جو مبدار فیاض نے ہر افسر اور ماتحت قسم کے انسان کو یکساں طور پر عطا فرمایا ہے دماغ میں چکر کھا کھا کر رہ جاتا ہے۔ طبیعت مشتعل ہوتی ہے۔ اشتعال بہانے ڈھونڈھتا ہے۔ اور بہانہ اس کو آخر کار وہی ملتا ہے۔ جس کو ہم آپ "خواہ مخواہ" کہتے ہیں۔ چنانچہ وہ دفتر کی چار دیواری تک تو بمشکل صبر اور ضبط

کام لیتا ہے۔ مگر گھر کی چار دیواری میں قدم رکھتے ہی جنگجو بن جاتا ہے۔ بیوی
کو کیا خبر کہ میاں کس رنگ میں آرہے ہیں۔ وہ بدستور سروتے سے ڈلی کاٹتی رہیں گی
اور میاں آتے ہی لڑائی شروع کر دیں گے۔ "کہ یہ...... یہ...... ڈلی کٹ رہی ہے۔
دن رات ڈلی۔ دن رات سروتے کی کھٹا کھٹ۔ تمھارے پاس اور کام ہی کیا ہے
کس عاجزی سے کہہ گیا تھا کہ کوٹ میں بٹن ٹانک دینا مگر میں تو کتا ہوں بھونکتا
رہتا ہوں۔" بیوی حیران ہو کر کوٹ میں ٹنکا ہوا بٹن دکھاتے ہوئے کہے گی۔
"پوچھ تو لیا کرو پہلے بات اس کے بعد ہی غصہ کیا کرو۔ یہ دیکھو سب بٹن ٹانک دیئے
ہیں۔" میاں بٹن دیکھ کر بجائے قائل ہونے کے فرمائیں گے۔ "یہ بٹن ٹانکے گئے ہیں۔ گویا
میں اندھا ہی نہیں بے وقوف بھی ہوں، بدگار ٹالی گئی ہے۔ ارے تم، تم بھلا کیا بٹن
ٹانکو گی جس کے سگھڑاپے کا حال یہ ہو کہ صبح سے میں نے دانت تک نہیں مانجھے ہیں۔
بیوی حیران رہ جائے گی۔ کہ بٹن تک تو خیر غنیمت تھا۔ مگر دانت ان کے اور سگھڑاپا اس
کا یہ کیا معمہ ہے۔ اس کو حیران دیکھ کر آپ اور بھی بھڑکیں گے۔ اب بھولی صورت
بنا کر کھڑی ہو گئیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ جب منجن ختم ہو گیا تھا۔ تو کیوں نہیں رکھا گیا۔
تم میری لگی لگائی نوکری چھوڑوا دو گی۔ ارے صاحب جب ہم ان میلے دانتوں کو
لے کر حاکم کے سامنے جائیں گے۔ تو وہ ہم کو بھلا نوکر رہنے دے گا۔ مار کر کھڑے
کھڑے نکال باہر کرے گا۔ مگر تم تو یہ چاہتی ہی ہو کہ میں بھیک مانگوں جس دن سے
یہ نوکری ملی ہے۔ تمھارے بھائی صاحب برابر طعنے دیتے ہیں۔ جب دیکھئے مبارکباد
جب دیکھئے مبارکباد جلے ہی جاتے ہیں۔ بیچارے اور خود حال یہ ہے کہ "نہ کام
کے نہ کاج کے ڈھیر بھر اناج کے۔" بیوی غریب کے منہ میں بھی زبان ہوتی ہے۔

اگر وہ کچھ بول دے تو قیامت آگئی۔ برتن ٹوٹے، کپڑے پھٹے، گڑے مُردے اُکھڑے اور آخر میں دروازہ پر بیوی کی ڈولی آگئی میکے جانے کے لئے اور میاں کو ہوش اس وقت آیا جب بیوی جا چکی تھیں۔ اس قسم کے اُلجھانے میں الجھانے والے کو بعد میں ندامت بھی ہوا کرتی ہے۔ اور اس کی سمجھ میں یہ بات خود آجاتی ہے کہ یہ خواہ مخواہ کی لڑائی تھی۔ دراصل یہی احساس سب سے زیادہ کمزور پہلو ہے۔ جس سے لڑائی کا سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔ لڑائی کو احساس اور سمجھ سے کیا سروکار۔ یہ بات الجھنے والی صورت میں نہیں ہوتی۔ لہٰذا ہمارے نزدیک وہی طریقہ افضل ہے۔

تکلفاتِ لکھنؤ!

کہا جاتا ہے کہ ؎ خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے۔

اس ایک مصرعہ میں "پھر" اور "غنیمت" لکھنؤ کی بربادی پر بہے ہوئے دو آنسو ہیں۔ جس "پھر بھی غنیمت" لکھنؤ کو ہم اب دیکھ رہے ہیں وہ بھی اس تیزی سے اپنی روایات کو بھلا رہا ہے کہ کچھ ہی دنوں میں اس مصرعہ کا "پھر" اور اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے "غنیمت" بھی غائب ہو جائے گا۔ البتہ یہ دعا شاید مقبول ہو جائے کہ لکھنؤ آباد ضرور رہے گا۔ مگر اپنی مخصوصیت کے ساتھ نہیں بلکہ ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں کی طرح وہ ایک شہر ہو کر

لکھنؤ کے متعلق معلوم نہیں یہ فال نیک ہے یا بد شگونی بہر حال جو کچھ بھی ہے اس کے آثار اب خود لکھنؤ میں نظر آنے لگے ہیں۔ کہ لکھنؤ کی جس تہذیب اور تکلف کا مذاق باہر والے اڑایا کرتے تھے۔ اب اسی تہذیب اور تکلف پر خود لکھنؤ مسکرانے لگا ہے۔ "پہلے آپ" اور "نہیں حضرت پہلے آپ" قسم کے تکلفات پر پہلے وہ لوگ ہنسا کرتے تھے۔ جو ان آداب کی پابندی کرنا نہیں جانتے تھے۔ لیکن اب ان آداب کو بھولنے والے بھی لکھنوی تہذیب کی ان نزاکتوں کو چونچلہ اور ڈھکوسلہ وغیرہ کہہ کر ان تکلفات کو اپنے لئے تکلیف دہ پاتے ہیں۔ اور خدا بھلا کرے ذوق کا، جو ان بے تکلف لوگوں کے لئے ایک سدا بہار عذر لنگ ارشاد فرما گئے ہیں کہ ؎

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے

مگر تکلف کی گہرائیوں میں جائیے تو تکلف کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے جب حضرت آدم نے پتوں سے ستر پوشی کی تھی یہ تمام بالوں کی آرائشیں لباسوں کی کاٹ چھانٹ اور اسی طرح زندگی کے ہر شعبہ میں ہر قسم کا سلیقہ سوائے تکلف کے اور ہے کیا۔ گو آرام سے وہ رہ سکتے ہیں جو انسانیت کے قریب ہی نہ آئیں۔ اور چوپایوں کی بے تکلفی سے سبق لیں۔ اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ نے تکلفات کی حد کردی تھی۔ مگر اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ شاہی زمانے کے تمام درباری تکلفات اہل لکھنؤ کے لئے روزمرہ بن گئے تھے۔ اور چونکہ وہ ان تکلفات کے عادی ہو گئے تھے۔ لہذا ان کو کوئی تکلیف نہ ہوتی تھی۔ اور ان کی شائستگی خود ان کے لئے

ایک بے ساختہ سی چیز بن کر رہ گئی تھی۔ علم مجلس، نشست و برخاست صرف مجلسی زندگی ہی تک محدود نہ تھا۔ بلکہ گھر میں اور باہر یکساں قسم کی باقاعدگی سی معلوم ہوتی تھی۔ برابر والوں سے ملنے، چھوٹوں سے ملنے اور بڑوں سے ملنے کے کچھ الگ الگ آداب تھے۔ جن کی پابندی وہ اپنے اوپر فرض سمجھتے تھے تاکہ ان کی شاہانہ تہذیب اور لکھنؤ کی شائستگی پر حرف نہ آئے۔ اسی مہذب نشست و برخاست سے صاحبِ محفل نہایت خاموشی کے ساتھ اہل محفل کو یہ بتا دیتا تھا۔ کہ ہر نئے آنے والے سے اس کے تعلقات کس قسم کے ہیں۔ اور اس کا درجہ اس کی نظروں میں کیا ہے۔ مثلاً کسی کے لئے سروقد کھڑے ہو کر اور لب فرش تک جا کر استقبال کرنے کے معنی یہ ہوئے کہ آنے والا صاحب محفل کے لئے بزرگ و برتر کا درجہ رکھتا ہے اور چونکہ صاحبِ محفل ان کو یہ عزت دے رہا ہے۔ لہذا تمام اہل محفل پر اس کا احترام فرض ہے۔ سب کھڑے ہو جائیں گے۔ اور اس وقت تک کھڑے رہیں گے جب تک کہ وہ بیٹھ نہ جائے کوئی اس سے کم مرتبہ کا شخص آیا تو صاحب محفل صرف کھڑے ہو کر تعظیم دیں گے۔ لب فرش تک جانے کی ضرورت نہیں۔ اس سے بھی کم درجہ کا کوئی شخص آیا تو صرف ساٹھ ڈگری کے زاویہ تک اٹھنا کافی ہوگا۔ کسی کے لئے محض تیس ہی ڈگری کا زاویہ کافی ہوگا۔ اور کسی کے لئے بیٹھے ہی بیٹھے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ "تشریف لائیں جناب"۔ یا کوئی بے تکلف دوست آ گیا تو نہایت تکلف کے ساتھ بے تکلفی بھی ہو گی کہ "تشریف لائیے سرکار"۔ ع

بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے

کسی اور نے ایک چھینٹا مارا کہ حضرت :۔

"ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا"

ایک تیسرے دوست نے برجستہ کہدیا۔

"کہیں یہ نہ پوچھ لیجئے گا کہ عناں گیر کون تھا"

مگر یہ با تکلف بے تکلفی بھی اُن بزرگ کی موجودگی میں مشکل ہی سے ہو سکتی ہے جن کے لئے لب فرش تک استقبال کیا گیا تھا۔ اُن کے سامنے تو خود صاحب محفل ان کو صدر میں بٹھا کر دو زانو بیٹھیں گے۔ ان کو کوئی چیز پیش کریں گے۔ تو کھڑے ہو کر ان سے کوئی چیز لیں گے تو متعدد تسلیمات کے بعد۔ مگر ایسے بزرگ خود بھی خوردوں کی محفل میں زیادہ نہ ٹھہرتے تھے۔ مگر ان کے تشریف لے جانے کے بعد بھی برابر والے بے تکلف دوستوں کی اس محفل میں بھی شائستگی قائم رہتی تھی۔ کوئی ایک دوسرے کی طرف پشت کر کے نہ بیٹھتا۔ گفتگو میں بھی آپ اور جناب۔ حضور، اور سرکار، حضرت اور بندہ نواز کے علاوہ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا۔ کہ کوئی ایسی بات بے تکلفی میں بھی زبان سے نہ نکل جائے جس سے کسی کی ہتک کا کوئی پہلو نکلتا ہو، یا مخاطب کو یہ محسوس ہو سکے۔ کہ اُس کی عزت کرنے میں کوتاہی سے کام لیا جا رہا ہے پیچوان اور خاصدان تک کے پیش کرنے میں اس قسم کی احتیاطوں سے کام لیا جاتا تھا۔ کہ ملازم صاحب محفل کے پاس پیچوان یا خاصدان رکھ گیا ہے۔ تو خود صاحب محفل اُٹھ اُٹھ کر حاضرین کو پیش کریں گے۔ اور حاضرین کھڑے ہو ہو کر یا مختلف زاویوں سے کھڑے ہو کر سلام کر کے لیں گے۔ بذلہ سنجیاں ہوں گی۔ لطیفہ گوئیاں ہوں گی۔ شعر و شاعری کا ذوق ہے تو اس کا چرچہ رہے گا۔ علمی ذوق ہے۔ تو علمی مباحث چھڑ جائیں گے۔ مگر جو کچھ بھی ہوگا۔ تہذیب کے دائرے میں۔ کسی نے کسی کے

لطیفے کی داد دی۔ اور وہ آداب بجا لا کر کھڑا ہو گیا۔ کسی نے کسی کے شعر کو سراہا اور وہ تسلیمات عرض کرتا ہوا دست بستہ ہو گیا کہ "میں کس قابل ہوں یہ سب ذوقِ سماعت ہے"۔ یا شعر پیش کرتے ہوئے خاص طور پر توجہ دلانے کے لئے اپنے بہت اچھے شعر کو یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ "شاید کسی قابل ہو"۔ یہ چند باتیں بھولے ہوئے سبق کی طرح لکھنؤ کے مشاعروں میں اب تک نظر آ جاتی ہیں۔ مگر اب وہ مشاعرے بھی ختم ہو رہے ہیں۔ فرش کی جگہ مشاعرے کرسیوں پر ہونے لگے ہیں۔ وہ مشاعرہ قائم ہونے کے بجائے پلیٹ فارم اور اسٹیج کا رواج بڑھ رہا ہے۔ شمع محفل کب کی گُل ہو چکی۔ پیچوانوں کی جگہ مشاعروں میں سگریٹ اچھلنے لگے ہیں۔ اور پانوں کی شالباف منڈھی کاغذی ہانڈیوں کی جگہ رکابیوں میں بیڑے تقسیم ہوتے ہیں۔ مگر اس قسم کے فقرے مشاعروں میں اب تک سننے میں آ جاتے ہیں۔ کہ "آداب بجا لاتا ہوں۔ دل بڑھاتے ہیں آپ، ملاحظہ ہو شاید کوئی نئی بات عرض کی ہے"۔ ورنہ اب تو مشاعروں کا یہ رنگ ہے کہ داد کی جگہ تالیاں بجتی ہیں۔ اور شاعر سلام کرنے کی جگہ اس طرح اکڑ جاتا ہے کہ سلام کس بات کا۔ واہ ہمارا ایک حق تھا جو ہم کو ملا کسی نے بخشش تھوڑی دی ہے کہ سلام کیا جائے۔

سلام پر یاد آیا کہ لکھنؤ کے "آداب عرض" اور "تسلیمات عرض" پر بھی لوگ ہنستے ہیں کہ یہ کلائی کے قریب کوئی کمانی فٹ ہوتی ہے۔ یا کیا کہ ایک سلام کرنے کے لئے خدا جانے جلدی جلدی کتنی جنبشیں دئیے جاتی ہیں۔ ورنہ سلام کا عام طریقہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ پیشانی کی طرف ہاتھ گیا اور قصہ ختم، ہو گیا سلام، یہ کیا کھڑے لچکا رہے ہیں، ہاتھ بید کی طرح، اور تسلیم بھی نہیں بلکہ کہہ رہے ہیں

تسلیمات کورنشات، اس بات پہ ہنسنے کی جگہ اگر ذرا بھی غور کیا جاتا تو یہ بات سمجھ میں آسکتی تھی۔ کہ سلام کا یہ طریقہ بھی شاہی دربار سے نکلی ہوئی ایک چیز تھا۔ دربار میں سلاموں کی تعداد مقرر تھی۔ اسی طرح امرار کے لئے بھی سلام مقرر تھے۔ مثلاً سات سلام یا پانچ سلام یا تین سلام، سلام کا مقصد تعظیم دینا ہے۔ اور سلام ہمیشہ چھوٹا بڑے کو کرتا ہے۔ لہذا لکھنؤ کے سعادت مند خوردوں نے اپنے شفیق بزرگوں کو وہی تعظیم دینا شروع کردی جو رعایا بادشاہ کو دیتی ہے یا غریب امیر کو دیتے ہیں۔ تسلیم کے بجائے تسلیمات اور کورنش کی جگہ کورنشات کا متعدد سلاموں سے مطلب ہے کلائی کو بار بار جنبش دینے کا مقصد بھی یہی ہے کہ کئی سلام کر لئے۔ اسی طرح "آداب بجالاتا ہوں" کا تفصیلی مطلب ہے کہ وہ تمام آداب بجالاتا ہوں۔ جو ایک خورد کو اپنے بزرگ کے سامنے، ایک کمتر کو اپنے بہتر کے سامنے جھک کر متعدد سلام کرکے اور دست بستہ کھڑے ہوکر بجالانا چاہیں۔

اسی طرح لکھنؤ کے لب و لہجہ اور گفتگو میں "چناں چنیں" پر بھی لوگ ہنستے ہیں۔ مگر اس پر بھی غور کیا جائے تو شاہانِ اودھ کی وہ تاریخ سامنے آجائے گی۔ جس نے یہ تمام طریقے اپنے دربار میں پروان چڑھائے تھے۔ شاہانِ اودھ کی دلچسپیوں کے مرکز ان کے محلات ہوا کرتے تھے۔ وقت کا بیشتر حصہ بیگمات کے ساتھ گذرتا تھا لہذا قدرتی طور پر زبان میں وہی لوچ اور نزاکت پیدا ہوگئی جو بیگمات کی زبان میں ہوا کرتی تھی۔ لب و لہجہ میں بھی انسائیت سما گئی اور بادشاہ نے سرِ دربار یہی محلسرائی زبان اختیار کی نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ دربار کی زبان بھی وہی بن گئی اور رفتہ رفتہ لکھنؤ کی اصل زبان بیگماتی زبان قرار پائی مگر اس میں شک نہیں کہ اس زبان کی لطافت

کچھ اور نکھر آئی عام زبان اور خاص زبان میں پتھراؤ اور گل افشانی کا نمایاں فرق محسوس ہونے لگا مثلاً ایک معمولی سا فقرہ ہے "والد صاحب مرحوم و مغفور کہا کرتے تھے"۔ اسی بات کو اگر یوں کہا جائے کہ "ابا جانی جنت مکانی کا ارشاد تھا"۔ اب دونوں کا نمایاں فرق محسوس کریجیے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے جملے نے سماعت پر کچھ پتھر برسائے تھے۔ اور اس جملہ نے پھول برسائے ہیں۔ والد صاحب مرحوم و مغفور میں وہ محبت بھی محسوس نہیں ہوتی جو ابا جانی جنت مکانی میں ہے۔

رہ گیا "چناں چنیں" والا اعتراض، یہ ہے تو درست مگر اس کی وجہ بھی زیادہ ترشائستگی ہے۔ لکھنؤ کی شاہانہ تہذیب نے اس کی اجازت کبھی نہ دی کہ کسی ناگوار بات کو براہِ راست ناگوار طریقہ پر ادا کر دیا جائے۔ اگر ایک ناگوار بات بھی خوشگوار طریقہ پر کہی جا سکتی ہے تو کیوں نہ کہی جائے۔ مثلاً غصہ میں کسی سے یہ کہنا کہ میں تمھاری شرارتوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ پھر میں جو کچھ کہوں گا۔ تو تم کو برا لگے گا۔ بظاہر اس جملہ میں بھی غصہ کو دبے ہوئے شائستگی موجود ہے۔ مگر اس موقع پر ایک خالص لکھنوی کچھ اور ہی کہے گا۔ اس کے تیور ہی کچھ اور ہوں گے۔ وہ پہلے تو غصہ کو پیے گا۔ پھر شائستگی کا سہارا لے کر سنبھلے گا۔ اور آخر میں یہ کہہ دے گا۔ کہ:۔

آپ ہی اپنے ذرا لطف و کرم کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

شرارت کی جگہ لطف و کرم کہنا "چناں چنیں" ہے۔ مگر غور کیجیے تو شرارت میں وہ زہر نہیں ہے جو لطف و کرم میں ہے۔ اس قسم کی چناں چنیں ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ کہاں تک کوئی کونین پر شکر لپیٹنے کا خیال رکھ سکتا ہے مگر اہل

لکھنؤ جو اپنی اس خصوصیت کو بھولتے جاتے ہیں پہلے بے تکلفی اور روانی کے ساتھ اسی قسم کی گفتگو کیا کرتے تھے۔ اور اس درباری احتیاط نے رفتہ رفتہ عادت کی صورت اختیار کرلی تھی۔

اور کچھ نہ بھی سہی تو بھی یہ ماننا ہی پڑے گا۔ کہ اس تکلف اور شائستگی نے لکھنؤ میں جو بلا کی قوت برداشت اخلاق کے نام سے پیدا کردی تھی۔ اس کا اب کہیں پتہ نہیں چلتا۔ کسی کے ساتھ ہمدردی کرنا یا نہ کرنا یہ دوسری بات ہے۔ مگر ایک دوسرے کا درد دل انتہائی یگانگت کے ساتھ سنتے تھے۔ اور اس قسم کی گفتگو کرتے تھے۔ کہ پریشان حال کو محض الفاظ سے تسکین ہو جایا کرتی تھی۔ آج کل کی سوسائٹی میں تو اگر کوئی شخص اپنی ماں یا باپ کی بیماری کا ذکر بھی کردے تو لوگ اس کو بدتمیز سمجھتے ہیں۔ مگر داد دیجئے ان باوضع اہل لکھنؤ کو جو احباب کی بیٹیوں تک کا حال پوری ہمدردی اور دلچسپی سے گھنٹوں سنا کرتے تھے۔ اور کیا مجال کہ چہرہ پر ذرا بھی بے توجہی پائی جائے۔ کسی کا بس یہ کہدینا شرط ہے کہ :۔

"کیا عرض کیا جائے شیر جنگ کی علالت نے اور بھی رہے سہے اوسان کھو دیئے ہیں۔"

دوسرے صاحب فوراً تشویش کے ساتھ کہتے "نصیب دشمناں کب سے علیل ہے"؟

تیسرے صاحب بولتے "حضرت علیل کیا ہے۔ ہمیشہ بھائی صاحب سے عرض کیا کہ نظر اتار دیا کریں۔ میری آنکھوں میں خاک اس کے بتور ہی ایسے ہیں کہ نظر لگ جائے۔ پچھلی پالی میں دیکھا نہیں آپ نے۔ چشم بددور وہ پوٹا تان کر کھڑا ہوا ہے۔

کہ میرا تو کلیجہ اسی وقت دھک سے ہو گیا تھا۔ کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ بلکہ میں نے بھائی صاحب کی خدمت میں عرض کیا تھا۔ کہ پیشانی پر کاجل کا ٹیکہ لگا دیں۔ یا کوئی سیاہ ڈورا گلے میں باندھ دیں۔

بٹیر والے صاحب فرماتے "حضرت کونسی جھاڑ پھونک ایسی تھی جو نہ کی ہو۔ اب میری صاحب کے نسخے سے کچھ افاقہ ہے"

دوسرے صاحب کہتے ہیں "بھئی شکر ہے کہ افاقہ کا مژدہ تو سنا ہے ورنہ تو پیروں تلے کی زمین ہی نکل گئی تھی۔"

یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی بٹیر کی جان ہرگز عزیز نہ ہوگی۔ مگر مروت بھی کوئی چیز ہے۔ ایک دوست کی اس تفریحی مصیبت تک سے سب بظاہر پریشان ہو گئے اس دوست کو کچھ اور نہیں تو کم از کم یہ اندازہ تو ضرور ہوا ہوگا۔ کہ مجھ سے ہمدردی کرنے والے اس دنیا میں موجود ہیں۔ جو بٹیر کی بیماری پر اس قدر ہمدردی کر سکتے ہیں وہ انسان کی بیماری پر تو ظاہر ہے۔ کہ اس سے بھی کچھ آگے بڑھ جاتے ہوں گے۔ مگر اب تو وہ مروت، وہ ہمدردی اور وہ رفاقت ہی تاریخی چیز بن گئی ہے۔ بٹیر کی علالت پر ہنسنے کو سب ہنس دیں گے۔ مگر بیٹے کے بہانے جس اخلاق کا مظاہرہ ہوا ہے۔ اس کی گمشدگی پر رونے والا ایک بھی نہ ہوگا۔ بلکہ کہنے والے ڈھٹائی سے یہی کہدیں گے۔ کہ شکر ہے کہ وہ ریاکاری گئی۔ حالانکہ یہ کہنے کا حق اس وقت حاصل ہوتا ہے۔ جب بٹیر کے لئے نہ سہی کسی انسان کے لئے اس جھوٹی ہمدردی کی طرح کی سچی ہمدردی ہم اپنے میں پیدا کر لیں۔ جھوٹی ہمدردی تو خیر گئی۔ مگر رونا تو یہ ہے سچی ہمدردی پیدا نہ ہو سکی اور جھوٹی بھی ہاتھ سے گئی۔

لکھنؤ کے شاہانہ تکلفات کا تو کہنا ہی کیا۔ یہ تو صرف چند اوپری باتیں ہیں۔ جو دربار سے نکل کر اہل لکھنؤ کی عام زندگی بن گئی تھیں ورنہ درباری لباس، درباری دسترخوان، درباری محفلیں، درباری نشست و برخاست وغیرہ کے تکلفات کا تو اگر ذکر بھی کیا جائے تو لوگ یہی کہیں گے کہ یہ درباری جھوٹ ہے اور ایسے جھوٹے آج کل نہیں ملتے۔

ادیبوں کی لڑائی!

مجھ کو بہت سی لڑائیوں کا ذاتی تجربہ بھی ہے۔ بہت سی لڑائیاں دیکھی ہیں بہت سی پڑھی ہیں۔ اور بہت سی سُنی ہیں۔ اور آخر کار اس فن کے متعلق اس رائے پر پہنچا ہوں کہ لڑائی خواہ وہ کسی قسم کی ہو۔ اگر وہ بے ادبی کی حد تک نہیں پہنچی ہے تو وہ میرے نزدیک لڑائی کی تعریف میں نہیں آتی۔ لڑائی کا اصل بے ادبی اور بے تکلفی ہے۔ اگر فریقین ایک دوسرے سے اتنے بے تکلف بھی نہیں ہیں کہ آپس میں بے ادب اور گستاخ ہو سکیں۔ تو نہ ان کی لڑائی مستند ہے نہ ان کو لڑنے کا سچ پوچھئے تو کوئی حق پہنچتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ادب اور تہذیب کا لحاظ رکھ کر آج تک جتنی لڑائیاں لڑی گئی ہیں۔

وہ لڑائی تو نہیں البتہ اپنے نتیجہ پر پہنچکر ایک قسم کا چٹکلہ ثابت ہوئی ہیں۔ اور میں نے تو اس قسم کی لڑائیوں کو جن میں بے ادبی اور گستاخی سے کترا کترا کر لڑنے کی کوشش کی جارہی ہو۔ ہمیشہ ایک قسم کا تبادلۂ خیال سمجھا ہے۔ لڑائی کا تو کبھی وہم و گمان بھی نہیں ہوا۔ البتہ اگر کسی لڑائی میں خلوص دل کے ساتھ کچھ ناگفتہ بہ الفاظ ادھر سے اور کچھ شرربار و آتش فشاں اگر ساتھ ہی ساتھ غیر مہذب الفاظ اُدھر سے تھرا تھرا کر ناچ ناچ کر، اداکاری اور بمباری کی درمیانی کیفیت کے ساتھ ادا کرتے ہوئے سُنے ہیں۔ تو دل باغ باغ ہو گیا ہے۔ ضروری سے ضروری پروگرام ملتوی کر دیا ہے۔ بائیسکل سے اُتر پڑے ہیں۔ تانگے کو رکوا دیا ہے اور گھنٹوں اس قسم کی لڑائی سے لطف حاصل کیے کم سے کم دل کو یہ اطمینان دلا دیا ہے۔ کہ اس گئی گذری حالت میں بھی لڑائی کی صحیح سپرٹ موجود ہے۔ اور یہ فن ہمارے بزرگوں کے دوسرے فنون کی طرح کم سے کم بالکل ہی ختم نہیں ہوا ہے۔ البتہ ادبار کی علامتیں اور تباہیوں کے آثار اس طرح نمایاں ہو رہے ہیں۔ کہ جس طرح تمام دوسرے فن نااہلوں اور ناجنسوں کے ہاتھ میں پہنچکر موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ وہی حشر اس لڑائی کے فن کا نظر آرہا ہے۔ غضب خدا کا ادیبوں نے یہ مشغلہ شروع کر دیا ہے۔ ادب ایک دوسرا فن ہی لڑائی کچھ اور چیز۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہوئی کہ جیسے دو مرغ آپس میں لڑنا چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا تازہ کلام سُنانا شروع کر دیں۔ آپ کہیں گے کہ یہ بات کیا ہوئی۔ مرغ کو کلام سے کیا نسبت؟ تو میں عرض کروں گا۔ کہ ادیب کو لڑنے سے کیا سروکار، لیکن ادیب لڑتے ہیں۔ بڑی بڑی معرکہ کی اور تاریخی لڑائیاں لڑ چکے ہیں اور یہ ادبی لڑائیاں لڑ چکے ہیں۔ اور یہ ادبی لڑائیاں برابر ہوتی ہی رہتی ہیں۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ادیبوں کی لڑائی میں عام طور پر صرف ایک جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ یعنی اپنا نام اور دوسرے کی ٹوپی اُچھالنے کا جذبہ، اب یہ آپ کو اختیار ہے کہ اسی اکلوتے جذبے کو آپ بہت سے ماتحت جذبوں میں تقسیم کر دیں۔ مثلاً دوسروں کی غیر معمولی مقبولیت اور اپنے بجھتے ہوئے چراغ پر کسی ادیب کو اگر غصہ آجاتا ہے تو وہ لڑ بیٹھتا ہے۔ اس لڑائی کو عام طور پر تنقید سے شروع کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ تنقید محض بہانہ ہوتا ہے۔ لہٰذا تنقید تو برائے نام رہ جاتی ہے۔ تو تو میں میں البتہ زیادہ ہوتی ہے۔ مثلاً فرض کر لیجئے۔ کہ کوئی بیچارہ شاعر ایسا ہے۔ جو شاعری ذوق کے لئے اور کپڑے کی دوکان پیٹ کے لئے کرتا ہے۔ اب اس پر جن صاحب کو غصہ آئے گا۔ وہ کچھ اس طرح کی تنقید فرمادیں گے کہ "جناب کے کلام میں ململ کی سی نرمی، مخمل کی سی نفاست اور کمخواب کی سی دلآویزی تو بظاہر بہت ہے مگر دمن سے آپ کو شاید کوئی سروکار نہیں۔ مصرعے بھی غالباً گز ہی سے ناپتے ہیں۔ اور گرہ دو گرہ کی کمی بیشی کی چنداں پروا نہیں کرتے" یہ تو ہوئی تنقید۔ اب جواب تنقید میں سب سے پہلے جواب دینے والے صاحب کو یہ فکر ہوگی کہ تنقید نگار کا پیشہ کیا ہے۔ فرض کر لیجئے کہ معلوم یہ ہوا کہ جن صاحب نے تنقید کی ہے۔ وہ گھوڑوں کی تجارت کرتے ہیں۔ لہٰذا جواب تنقید اس طرح شروع ہوگا۔ "جناب کا عالم تو یہ ہے۔ کہ اڑیل ٹٹو کی طرح ایک جگہ اڑ کر رہ گئے ہیں۔ آنکھوں پر اندھیری بندھی ہوئی ہے۔ پرانے شہسواروں نے جو راستہ بتایا تھا اسی پر کبھی کبھی دُلکی کی مشق ہو جاتی ہے اور کبھی سرپٹ بھی ہو جاتے ہیں۔ مگر واقع ہوئے ہیں۔ کچھ ایسے بے لگام کہ اکثر اپنے سائے سے بھی بھڑک اُٹھتے ہیں۔ تنقید اور جواب تنقید دونوں کے نمونے آپ

نے ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں نہ اعتراض کا پتہ چلتا ہے نہ کوئی فنی بحث ہے۔ البتہ
چوٹیں ضرور ہیں۔ اور تو تو میں میں کا اندازہ ذرا مہذب سا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے
کہ فنی بات تو خیر کوئی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ رہ گئی خالص لڑائی وہ بھی کچھ یوں ہی سی ہو کر
رہ گئی ہے۔ یعنی نہ ادب نہ بے ادبی بلکہ سچ پوچھیے تو کچھ اناڑی پن سا دونوں حیثیتوں
سے معلوم ہوتا ہے گویا ارادہ تھا اپنا نام اور دوسرے کی ٹوپی اچھالنے کا۔ مگر اچھل کر
رہ گئی دونوں کی ٹوپی اور نام بدنام ہوا۔ ادب اور لڑائی دونوں کا۔

ادیبوں کی لڑائی سے ایک فائدہ پہنچنے کی ہر ایک کو اُمید ہوتی ہے۔ کہ اب اسی
بہانے سے بہت سی پیچیدگیاں حل ہو جائیں گی۔ بہت سے ادبی راز سامنے آجائیں
گے اور بہت سی ایسی باتیں سامنے آجائیں گی۔ جو ان ہی ادیبوں کے ڈر کے مارے
کتابوں میں چھپی ہوئی بیٹھی ہیں۔ مگر یہ امید بہت ہی کم بر آتی ہے۔ اور اس لڑائی کا
تماشہ دیکھنے والے نتیجہ پر پہنچ کر کچھ مایوس ہی نظر آتے ہیں۔ اور شاذ و نادر ہی کچھ
پلے پڑتا ہے۔ پتے تو جب پڑے کہ جنگ برائے ادب ہو مگر عموماً ادب کو اکھاڑہ
اور ادیب کو پہلوان کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ لہذا یہ لڑائی بھی عموماً دنگل کی حیثیت
سے ختم ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس دنگل کی حیثیت سے جس میں دو برزخی پہلوانوں نے
تھوڑی دیر کشتی لڑی ہو اور پھر دونوں بیہوش ہو گئے ہوں۔ مشاعرہ بازی کے سلسلے
میں اس قسم کی لڑائیوں کے عجیب عجیب نمونے نظر سے گذرے ہیں۔ رسالوں اور
اخباروں کی ادبی لڑائیاں تو پھر بھی سند رہ جاتی ہیں۔ تاکہ بوقت ضرورت کام آئیں۔
مگر مشاعروں کی لڑائیاں تو بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور ان لڑائیوں کا لطف
دیکھنے والے کو اُسی وقت آسکتا ہے۔ جب نہ شعرائے کرام کی اندرونی سیاست سے

کچھ نہ کچھ واقف ہو۔ ایک ہی مشاعرہ میں مختلف اکھاڑے نظر آتے ہیں۔ ہر استاد کا ایک اکھاڑہ موجود ہے۔ بڑی بڑی نوزشتی غزلیں جیبوں میں لئے ایک سے ایک بیٹھا صفِ شعرا میں نظر آرہا ہے۔ ہر اکھاڑے کے ہواخواہ اور داد کا شور مچانے میں الگ ہیں۔ اگر دو استادوں کے باہمی تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ اور آپس میں چوٹیں چل رہی ہیں۔ تو پھر اس مشاعرے میں مزہ ہی آجائے گا۔ دونوں استادوں نے اپنے اپنے شاگردوں کو ایسی ایسی غزلیں کہہ کر دی ہوں گی۔ کہ گویا یہ صاحبزادے دل آج چھتیں اڑادیں گے۔ قتلِ عام کردیں گے۔ یا مشاعرے کی خاص اصطلاح میں دھوئیں پار کردیں گے۔ اُن استادوں کے چہرہ پر ایک دوسرے کے لئے تبسم بھی ہوگا۔ اخلاق بھی اور پوری شگفتگی بھی۔ مگر دلوں میں صرف یہ جذبہ کہ آج اس کو محفل میں ایسا رسوا کرو کہ پھر منہ دکھانے کے قابل نہ رہ جائے۔

مشاعرہ شروع ہوا، شمع گردش میں آئی۔ حریف استادوں سے زیادہ اُن کے شاگردوں کے تیور کڑے ہوگئے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر اینٹھے جلتے ہیں۔ برسے جاتے ہیں۔ ہواخواہ ہیں کہ حلق پھاڑ پھاڑ کر داد دے رہے ہیں۔ شعر کیسا ہی مہمل کیوں نہ ہو۔ مگر داد میں کوئی کمی نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح فریقِ مخالف اچھے سے اچھے شعر پر بھی کیا مجال ہے کہ ٹس سے مس ہوجائے۔ یہاں تک کہ کسی خاص قافیہ پر مشاعرہ گرم ہوگیا۔ اور اسی قافیہ پر زور آزمائیاں شروع ہوگئیں۔ اب استاد بھی مقابلہ پر ڈٹ گئے۔ اپنے شاگرد کی غزل پر اپنے حریف کو مخاطب کررہے ہیں جناب بیرقان ملاحظہ فرمائیے۔ اس بچہ نے ثریاں کا قافیہ کہہ دیا ہے۔ ہاں میاں مواد پڑھو۔ شاگرد نے مہک کر شعر پڑھا۔ مگر اتفاق سے کچھ غلط پڑھ گیا۔ مخالف

صف میں کہیں سرگوشیاں اور کہیں باقاعدہ کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ اِدھر استاد ہیں کہ شاگرد رشید کو ٹہوکے پر ٹہوکہ دے رہے ہیں۔ کہ پھر پڑھو، گھور گھور کر کھائے جاتے ہیں۔ کہ چل تو سہی گھر، ایسا مزا چکھاؤں کہ زندگی بھر یاد کرے۔ فریق مخالف کی صف کے کسی بتدی نے اپنی غزل میں گریبان کا قافیہ پڑھ دیا۔ آوازیں بلند ہوئیں گریبان اس کو کہتے ہیں۔ استاد نے نتھنے پھلا کر گردن کو معنی خیز جنبش دی اور مونچھوں پر تاؤ دے کر رہ گئے۔ مطلب یہ تھا کہ گریبان ایسا پیش کروں کہ دامن بچانا مشکل ہو جائے۔ یہاں تک کہ شاگردوں کا دور ختم ہوا۔ استادوں کی باری آئی۔ شاگرد سنبھل سنبھل کر بیٹھ گئے کہ اب ہے معرکہ، استاد نے یوں تو ساری غزل ٹھاٹھ کے ساتھ سنائی۔ مگر گریبان کے قافیہ پر مارے جوش کے ہکلا گئے۔ کف در دہان، آپے سے باہر، پاگلوں کی سی گت بنی ہوئی ہے۔ اور بار بار اپنے زانو پیٹ پیٹ کر فرما رہے ہیں۔ ؎

میری وحشت اس طرف ہو تیری عفت اُس طرف
تیرے دامن کی جگہ میرا گریباں چاہیئے

پسینہ پسینہ ہوئے جاتے ہیں۔ نزع کا سا عالم ہے۔ مگر یہ طے کر چکے ہیں۔ کہ اس شعر کے جھنڈے گاڑ کر مریں گے۔ سننے والے کچھ سہمے ہوئے بیٹھے ہیں۔ کچھ دعا کر رہے ہیں۔ کچھ بھاگنے کا موقعہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ مگر استاد کا یہ جان لیوا شعر کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتا۔ آخر کسی نہ کسی طرح غزل ختم ہو گئی ایک قیامت نے دم لیا۔ دوسرا محشر دوسرے استاد کی شکل میں برپا ہو گیا۔ گریباں کا قافیہ آتے ہی ایک دم سے ابل پڑے۔ ؎

تیرے ہاتھوں میں رہا میرا گریباں عمر بھر ✿ آج میرے ہاتھ میں تیرا گریباں چاہیئے

داد کے شور میں اُستاد پھُدک پھُدک کر سلام کر رہے ہیں۔ اور پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ انداز یہ ہے کہ معلوم نہیں کب پڑھتے پڑھتے واصل بحق ہو جائیں۔ سامعین اپنی جان سے بیزار نظر آتے ہیں۔ آدھی رات کے وقت یہ شور، محلے کے تمام کتے بھی پریشان ہیں۔ ان کو کون سمجھائے کہ تم کو اپنے لڑنے پر بڑا ناز تھا۔ ذرا اشرف المخلوقات کی لڑائی بھی دیکھ لو۔ اور اشرف المخلوقات کے بھی اس طبقہ کی جو عام انسانوں سے بھی کچھ بلند و بالا ہے۔ اس قسم کی لڑائی کا فیصلہ کچھ نہیں ہوتا۔ دونوں جیتتے ہیں۔ اور دونوں کے ذہن میں اپنی شکست نہیں آتی۔ دونوں کے ہواخواہ، دونوں کو اپنی اپنی جگہ سمجھاتے ہیں۔ کہ آپ ہی کامیاب رہے۔ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ "چھیڑ چلی جائے" اسد صاحب کے زمانہ میں یہ چھیڑ خوباں سے چلتی تھی۔ اب اُن ہی کی قوم کے افراد میں چلتی رہتی ہے۔ اور اس کا نام ادبی سرگرمی رکھا گیا ہے۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے ——

شاعری!

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

اچھا خاصہ شعر ہے۔ مگر دنیا اس حد تک کیا سے کیا ہو چکی ہے۔ کہ اب یہ شعر بھی آثارِ قدیمہ کی حیثیت سے اچھا معلوم ہو سکتا ہے۔ ورنہ آج کل محوِ حیرت ہونے کی فرصت کسے ہے اور نہ دراصل حیرت کی کوئی بات ہے۔ ہاں جس وقت کا یہ شعر ہے۔ اس وقت حیرت ضرور ہوتی ہوگی۔ اور لوگوں کے پاس حیرت کرنے، تصورِ جاناں میں بیٹھے رہنے یا محض اونگھنے کے لئے وقت بھی کافی تھا۔ اب تو زمانہ کی

رفتار اس قدر تیز ہے کہ اس قسم کے تفصیلی مشاغل کے لئے وقت ہی نہیں ملتا۔
ہمارے بزرگ آنکھ سے جو کچھ دیکھتے تھے۔ اُس پر پہلے تو اطمینان سے محوِ حیرت
ہو جایا کرتے تھے۔ پھر ٹھنڈے دل سے غور کرتے تھے۔ کہ جو کچھ دیکھا ہے۔ وہ
لب پر لائیں یا نہ لائیں اس کے بعد اپنے ہمعصروں سے مشورہ کرتے تھے۔ کہ بھئی
میرن صاحب کیا عرض کیا جائے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مگر سوچ رہا ہوں۔ کہ
کہوں یا نہ کہوں۔ یعنی کہوں تو کس زبان سے اور نہ کہوں تو کیوں کر "میرن صاحب
کے پاس بھی وقت کافی ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ جھوم کر جواب دیتے تھے۔ کہ:
سبحان اللہ کیا بات فرمائی ہے۔ آپ نے اس کے متعلق ایک فارسی کی ضرب المثل
یاد آ گئی "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" مگر جناب بندہ تو اس کا قائل ہے۔ کہ ؎

ہوتی ہے گرچہ کہنے سے یارو پرائی بات
پر ہم سے تو کبھی نہ کہی منہ پر آئی بات

میرن صاحب کے اس تفصیلی جواب پر یہ بزرگ پھر غور و فکر میں مبتلا ہو جایا
کرتے تھے۔ اور حقے سے دیر تک شغل فرمانے کے بعد نہایت آہستگی سے فرماتے تھے۔
کہ "کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا۔ اور بھئی میرن صاحب بن کہے بھی رہا نہیں جاتا
میں تو دنیا کے یہ رنگ دیکھ دیکھ کر دم بخود ہوں۔ اپنے ہی گھر میں وہ نقشہ دیکھ رہا
ہوں۔ کہ آنکھوں کا اعتبار اٹھ گیا ہے۔ عینک لگا کر دیکھتا ہوں تو اور بھی آنکھیں
پھوڑ لینے کو دل چاہتا ہے۔ جو کچھ آنکھیں دکھا رہی ہیں۔ یقین جانئے کہ بیان نہیں
کر سکتا۔ میرن صاحب فوراً ازلو پھٹ کر فرماتے تھے "ذرا ٹھہریئے گا حضور نا
آپ نے تو آمد ہی آمد میں ایک شعر کہہ دیا دیکھئے۔ ہوں۔ ہوں۔ آنکھ جو کچھ ہوں۔

لب۔ ہاں ٹھیک ہے۔ ملاحظہ ہو حضور مصرعہ ہوا ہے۔ ہنستے ہنستے بیٹھے۔ سُنئے۔

ع "آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں"

مصرعہ سُنتے ہی یہ بزرگ محترم آپے سے باہر ہو جایا کرتے تھے۔ بھئی کیا بولتا ہوا مصرعہ موزوں کیا ہے۔ کیا کہنا ہے۔ حیرت صاحب اس کو کہتے ہیں۔ حاضر دماغی، اور بھئی مصرعہ دیتا ہوں اس پر تمہیں میری قسم سنو کیا برابر کا مصرعہ ہوا ہے ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں — اور بھئی
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

باتوں ہی باتوں میں دونوں بزرگوں نے شعر کہہ لیا۔ رہ گئی کام کی بات وہ حیرت میں گم ہو کر لب پر آ ہی نہ سکی۔ مگر ان بزرگوں کی حیرت کے احترام میں دنیا اپنی جگہ قائم نہ رہ سکی۔ اور وہ کیا سے کیا ہو ہی گئی اور اس حد تک کیا سے کیا ہو گئی۔ کہ اب اُن ہی بزرگوں کے خردوں کو محو حیرت ہونے کے لئے ذرا سا بھی وقت نہیں ملتا۔ پہلے حیرت اور محویت کے جو ذرائع ہمارے بزرگوں کو حاصل تھے۔ اب وہی نہیں ہیں۔ تو حیرت اور محویت کہاں سے نصیب ہو۔ آپ ہی غور فرمائیے۔ کہ موٹر یا بائیسکل پر بیٹھ کر یا موٹریں اور بائیسکلیں چلنے والی سڑکوں پر چل کر کوئی کیوں کر محویت یا حیرت کے شوق کو پورا کر سکتا ہے۔ ذرا سی محویت طاری کیجئے تو فوراً حادثہ ہو جائے۔ خود کچل جائیے یا کسی کو کچل دیجئے۔ دراصل اسی قسم کی محویت اور حیرت کے سدباب کے لئے بڑے بڑے شہروں میں ٹریفک پولیس کا انتظام سرکار کی طرف سے کیا گیا ہے ہمارے بزرگوں کے وقت میں نہ یہ پابندیاں تھیں نہ یہ فراٹے بھرتی ہوئی موٹریں۔ وہ نہایت اطمینان سے بیل گاڑی پر بیٹھ کر جتنا دل چاہتا تھا محو رہتے تھے جس قدر جی چاہتا تھا۔ اپنے

اور حیرت طاری کر لیتے تھے گنگناتے تھے۔ شعر کہتے تھے اور لکھتے تھے۔ اور سفر بھی طے ہوتا رہتا۔ بلکہ اُن کی گاڑیوں میں جُتے ہوئے بیل تک اعلیٰ درجہ کے مفکر اور شاعر نظر آتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ میر سا شاعر پھر نہ پیدا ہوا۔ غالبؔ پر کوئی غالب نہ آسکا۔ اب کون سمجھائے ان حضرات کو کہ جناب والا میر نے ریلوں اور موٹروں پر بیٹھ کر شعر نہیں کہے ہیں۔ غالبؔ کسی دفتر میں کلرک یا کسی رسالے کے ایڈیٹر نہیں تھے۔ وہ شاعر تھے اور محض شاعر، گھروں میں لیٹ کر شعر کہتے تھے۔ بیل گاڑیوں پر بیٹھ کر شعر کہتے تھے۔ راتیں اپنی تھیں۔ دن اپنے تھے، وقت اپنا تھا۔ فرصتیں اپنی تھیں۔ گاڑی اپنی تھی اور بیل اپنے تھے۔ بجا وہ فرصتوں میں ڈھلے ہوئے اشعار کجا یہ شعر کہ بائیسکل پر بیٹھے گھڑی دیکھتے دفتر کی طرف جا رہے ہیں۔ نظریں ہیں ٹریفک پولیس کے اشاروں پر، کان لگے ہیں موٹروں کے ہارن پر، دل دھڑک رہا ہے اس خیال سے کہ کسی موٹر کی چپیٹ میں نہ آجائیں یا بائیسکل کی لپیٹ میں کوئی راہگیر نہ آجائے۔ اور زبان کی نوک پر مصرعہ طرح بھی موجود ہے شام کے مشاعرے کا، دفتر میں پہنچے تو سامنے فائیلوں کا ڈھیر اور گرد اہل غرض حضرات کا ہجوم اور سب کا الگ الگ مقصد، مصرعے دماغ میں آنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ منظر دیکھ کر بھڑک جاتے ہیں۔ بمشکل تمام جو مصرعے پھنس گئے اُن کو بلاٹنگ پیپر پر لکھ لیا۔ دن بھر اسی طرح مصرعے پھانسے، شام کو سب مصرعے جمع کر کے دو سے تقسیم کر دیئے حاصل تقسیم ہوئی اشعار کی تعداد اور یہی اشعار جا کر مشاعرے میں سنا دیئے۔ اب بتلایئے کہ یہ اشعار کیوں کر میر اور غالبؔ کا جواب ہو سکتے ہیں۔ میر اور غالبؔ کو ان ہی حالات میں مبتلا کر کے کچھ کہلوایئے تو پتہ چلے کہ وہ خود بھی اپنے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ یا نہیں۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ ہر زمانہ اپنی ضروریات کو خود سمجھتا ہے۔ اور خود ساتھ لاتا

ہے۔ فرصتیں تھیں تو طلسم ہوشربا لکھنے اور پڑھنے کا ذوق لایا فرصتیں محدود ہوئیں تو یہ ذوق ناول میں محدود ہو گیا۔ فرصت اور محدود ہوئی تو ناول افسانہ بن گئی۔ فرصت اور مختصر ہوئی تو افسانہ بھی مختصر ہو گیا اسی طرح شاعری نے زمانے کے ساتھ چولے بدلے فرصتیں مثنویاں کہلواتی تھیں مصروفیتیں غزلیں کہلوانے لگیں۔ مصروفیت اور بڑھی تو غزلیں بھی ختم آزاد شاعری سہی۔ جس وقت جتنی فرصت ملے اتنا بڑا مصرعہ کہہ لیجیے یہ نہیں کہ سب مصرعے برابر کے ہوں۔ بعد میں سب کو یکجا کر لیجیے۔ ایک نظم ہو جائیگی مثلاً آپ کو پانچ منٹ کی فرصت ہے تو آپ پانچ منٹ والا مصرعہ کہہ لیجئے۔

ع ہائے آغاز محبت کی وہ پہلی دھڑکن

پھر کسی وقت ایک منٹ کی فرصت ملی تو ایک منٹ والا مصرعہ کہہ لیا۔

ع جو ترے سینہ میں تھی

اسی طرح کبھی تین منٹ کی فرصت ملی۔ کبھی ڈھائی منٹ کی اور کبھی پونے چار منٹ کی، اسی مناسبت سے مصرعے ہوتے چلے گئے۔ اور آخر میں جا کر اچھی خاصی نظم کچھ اس طرح کی تیار ہو گئی ؎

ہائے آغازِ محبت کی وہ پہلی دھڑکن
جو ترے سینہ میں تھی
وہ دھڑکتا ہوا دل
کچھ مچلتے ہوئے ارمان بھی تھے مہر بلب
یعنی خموش
اور آنکھوں کے دریچوں میں وہ جب بیٹھی تھی۔

سیر کرنے کے لئے

گنبدِ عرش پہ تھے چاند ستارے لرزاں

خطِ سرطاں کی قسم

میں نے دیکھا ہے کہ خود کانپ رہی تھی تو بھی

ہائے آغازِ محبت کی وہ پہلی دھڑکن

اس نظم سے یہ بات ہر ایک کو معلوم ہو جائے گی کہ شاعر کوئی بیکار آدمی نہیں ہے۔ اس کو شاعری کے علاوہ دنیا میں اور کام بھی ہیں۔ اور اس کے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے کہ ہر مصرعہ کے لئے برابر کا وقت مہیا کرتا پھرے۔ مطلب یہ نظم سے وہ مختلف قسم کے مصرعوں سے بھی مرتب ہو سکتی ہے۔ فی الحال اس قسم کی نظمیں کہنے کے لئے وقت مل رہا ہے۔ لیکن جب اتنا بھی وقت نہ ملے گا تو آج کل جو عنوان ہوا کرتا ہے وہی نظم کا درجہ حاصل کرے گا۔ مشاعرے میں اعلان ہوگا۔ کہ اب شوکت تھانوی صاحب سے ان کی تازہ نظم سنیئے، شوکت تھانوی صاحب ڈائس پر آکر فرمائیں گے۔ عرض کیا ہے "اے بہار" مشاعرہ تالیوں کی گونج سے اڑ جائے گا۔ اور شوکت صاحب سلام کرتے ہوئے اپنی جگہ پر آ جایا کریں گے۔

بہر حال آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے۔ وہ آپ دیکھ لیجئے کہ اب لب پر بھی آ رہا ہے۔ رہ گیا محو حیرت ہونا وہ اس لئے بے کار ہے کہ حیرت عادت بن کر رہ جائے تو حیرت ہے کہ اس پر حیرت کی جائے۔ دنیا کے کیا سے کیا ہونے کا جہاں تک سوال ہے وہ اپنی اس مصروفیت سے باز نہیں آ سکتی۔ ہمیشہ اس نے یہی کیا ہے۔ اور آئندہ بھی اس کا یہی پروگرام ہے۔ پھر بڑی بوڑھیوں کی طرح ٹھنڈی سانس لیکر

ہم یہ شعر کیوں پڑھیں ۔ اور سوال تو یہ ہے کہ اس نئی شاعری کے زمانہ میں یہ پرانا شعر پڑھتا ہے ۔ یعنی تو بے وقت کی راگنی سوائے اس کے کہ آپ پڑھیں اور سننے والے ہنسیں آپ اس ہنسی پر حیرت زدہ ہوں اور وہ آپ کی حیرت کا تماشہ دیکھیں اور تو کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔



آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے

ضُعفِ بصر

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے' کا سوال دراصل در پردہ شکایت ہے۔ اس بات کی کہ آنکھ جو کچھ دیکھا کرتی تھی۔ وہ نہیں دیکھ رہی ہے۔ اور یہ واقعہ بھی ہے کہ جو کچھ ہمارے بزرگ دیکھا کرتے تھے۔ وہ اب ہم کو نظر نہیں آرہا ہے۔ اور جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں۔ وہ ہمارے بچے شاید ہی دیکھ سکیں۔ مثلاً ہماری آنکھ آج کل چشمہ دیکھ رہی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے یہ چیز بہت کم دیکھی تھی۔ اور ہمارے بچے شاید اس بات پر تعجب کریں کہ پہلے اس قسم کے انسان پیدا ہوتے تھے۔ جن کی آنکھوں پر چشمہ نہیں ہوتا تھا۔ صرف آنکھیں ہوا کرتی تھیں۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی آنکھوں کے علاوہ دوسروں کی آنکھوں پر اس کثرت سے چشمے نظر آنے لگے ہیں۔ کہ واقعی حیرت ہوتی ہے۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ کسی کی آنکھ پر چشمہ دیکھ کر لوگ اس سے عیادت کیا کرتے تھے۔ آنکھوں کا حال پوچھتے تھے۔ ایک آدھ آزمودہ سُرمے کا نسخہ بتا دیتے تھے۔ اور پھر گھبرا کر سب سے کہتے تھے۔ کہ خدا رحم کرے۔ قسمت کا لکھا پورا ہو رہا ہے۔ بڑھاپے کے چشمہ تک لگ گیا ہے۔ مگر اب تو صرف دو ہی قسم کے لوگ چشمہ نہیں لگاتے ایک تو اندھے دوسرے وہ بے فکرے جن کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں ہوتا ورنہ وہ چشمہ جو ضعیفی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ آج کل چھٹانک بھر کے لڑکے لگائے پھرتے ہیں یعنی ہوش بعد میں سنبھالتے ہیں۔ اور چشمہ پہلے ہی لگا لیتے ہیں۔ مرد تو مرد بیچاری عورتیں بھی اس مصیبت میں مبتلا ہیں۔ پہلے اُستانیاں اور معلمانیاں دو قسم کی خواتین چشمہ لگائے تو نظر آتی تھیں۔ مگر اب تو حال ہے کہ:۔ ع

مردانے سے زیادہ زنانے میں دھوم ہے

بچے کھچے بڑے بوڑھے تعجب سے ان چشموں کو دیکھتے ہیں۔ اور اپنی آنکھوں کا حال نہایت فخر سے بیان کرتے ہیں۔ کہ بچپن میں روپیہ کا پانچ سیر گھی کھاتے تھے۔ جو براہ راست نور بن کر آنکھوں میں پہنچ جایا کرتا تھا۔ گویا آنکھیں گھی سے روشن ہونے والے چراغ ہیں۔ اور چونکہ آج کل خالص گھی مشکل سے ملتا ہے۔ لہٰذا خالص بینائی بھی نہیں ملتی۔ اور عام طور پر بناسپتی آنکھیں لوگ لگائے پھرتے ہیں۔ اس گھی والی وجہ کے علاوہ چشمہ کے رواج کے متعلق ہر بڑی بوڑھی اور ہر بڑے میاں کی رائے الگ بھی ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی کہتا ہے۔ کہ یہ سب بجلی کی روشنی کے اندھے ہیں۔ کسی کا خیال ہے کہ انگریزی کتابیں آنکھیں پھوڑ دیتی ہیں۔ کسی کا فیصلہ ہے کہ سینما نے سب کو اندھا

گر رکھا ہے۔ ایک جنٹل مگری بڑی بی یہ بھی کہا کرتی ہیں۔ کہ یہ فیشن ہے۔ مگر ایک بزرگ جو
چشمہ والوں پر اعتراضات کے سلسلہ میں کچھ ریسرچ بھی کر چکے ہیں مختلف حیثیتوں سے
چشمہ کے اس عام رواج پر روشنی ڈالا کرتے ہیں۔ مثلاً ان کا خیال یہ ہے کہ لوگوں نے
آنکھوں کی ورزش چھوڑ دی ہے جس کی وجہ سے بینائی کمزور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ان
سے پوچھا کہ جناب والا یہ آنکھوں کی ورزش کیا چیز ہے۔ تو فرمایا کہ ہمارے زمانے میں
بینائی کو قوت پہنچانے کے لئے مختلف قسم کی ورزشیں کی جاتی تھیں۔ مثلاً پتنگ بازی:۔
پتنگ بازی میں صرف اڑانے والا ہی اپنی نظر کی ورزشیں نہیں کرتا۔ بلکہ تمام وہ لوگ جو
پیچ دیکھتے ہیں۔ اور کنکوؤں کے کاٹ پیچ پر نظر رکھتے ہیں۔ یہ ورزش کر لیا کرتے ہیں۔
ا۔ ورزش کا دوسرا طریقہ تھا کبوتر بازی، کبوتروں کو اڑا کر انتہائی بلندی پر گھنٹوں
کا تعاقب کرنے والی نظر کبھی کمزور نہ ہو سکتی تھی۔ ان کا بیان ہے کہ خود انھوں نے
چشمہ تو در کنار کتاب پڑھنے کے لئے چراغ تک کی ضرورت چاندنی راتوں میں کبھی
محسوس نہ کی۔ البتہ سرمے سے اپنی نظر کو ضرور مانجھا کرتے تھے۔ مگر اب جہاں بڑھاپے
کی دوسری کمزوریاں ہیں۔ ان ہی میں نظر کی کمزوری بھی ہے۔ رعشہ کے لئے کہاں سے
چشمہ لائیں۔ دمہ کے لئے کونسی عینک استعمال کریں۔ ان کا قول تو یہ ہے کہ جب کسی
اور کمزوری کے لئے چشمہ نہیں ہے تو محض آنکھوں کی سینہ زوری لے کر کیا کریں گے۔

چشموں کے اس طوفان کی اور وجہیں تو خیر ہیں ہی، مگر ایک وجہ ہماری سمجھ میں
اور بھی آتی ہے کہ ہمارے بزرگوں کے زمانے میں عینک کو لباس یا زیور کا درجہ حاصل
نہ تھا۔ اور اب تو اس صنعت میں ایسے تکلف برتے جاتے ہیں۔ اور ایسے ایسے نظر فریب
چشمے بننے لگے ہیں۔ کہ خواہ مخواہ آنکھیں پھوڑ کر عینک لگا لینے کو دل چاہتا ہے۔

کوئی ناک پکڑنے والی عینک ہے تو کوئی کان پکڑنے والی عینک ہے۔ کسی کا شیشہ گول ہے، کسی کا بیضاوی، کسی کا نیم گول اور نیم بیضاوی، کسی کی سونے کی کمانی ہے کسی میں محض شیشے کی تراش کا کمال ہے۔ کوئی ایک آنکھ کی ہے اور کوئی دونوں آنکھوں کی، پھر یہ کہ ان چشموں کو لگا کر چہرے میں عجیب عجیب تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ کوئی چشمہ لگا کر حسن بڑھتا ہے، کسی عینک سے چہرہ پر رعب برسنے لگتا ہے کسی چشمے میں یہ صفت ہے کہ معمولی آنکھ دیکھنے والے کو بڑی نظر آتی ہے۔ اور کسی چشمے کے بدولت ترچھی نظریں ایک آدھ زاویہ سے سیدھی نظر آنے لگتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک عام خصوصیت ہر چشمہ کی یہ ہے کہ چشمہ لگانے والا خواہ مہذب، تعلیم یافتہ، معزز اور کچھ بڑا آدمی نظر آنے لگتا ہے۔ ان تمام خصوصیات کا نتیجہ یہ ہے کہ نمبری چشموں کے علاوہ صفر نمبر کے تالوں کی بھی بازار میں کافی مانگ بڑھ گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ کس کا دل نہیں چاہتا کہ وہ عالم فاضل مہذب اور معزز، تعلیم یافتہ اور بڑا آدمی نظر آئے مختصر یہ کہ پہلے چشمہ دوا کے طور پر استعمال ہوا کرتا تھا۔ اور اب اس کو لباس یا زیور کی حیثیت حاصل ہے۔ گویا عورتوں کو ایک، اور صفت کا زیور ہاتھ آیا۔ اور مرد جو زیور پہن ہی نہیں سکتے تھے اپنی اس محرومی کی تلافی چشمے سے کر سکتے ہیں۔ اور کسی قسم کا چشمہ نہ سہی دھوپ ہی کا چشمہ سہی۔

خالہ صاحب خوب یاد آیا، یہ دھوپ کا چشمہ بھی عجیب جاجنت روا چیز ہے۔ اس کا رواج ہمارے ہی زمانے کی بات ہے اور اب تو اس کثرت سے دھوپ کے چشمے نظر آنے لگے ہیں۔ کہ شاید آنکھوں سے زیادہ ہی ان کی تعداد ہو گی۔ اس چشمے کو دھوپ کا چشمہ کہا جاتا ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ آخر یہ اب سے پہلے

کیوں نہ تھا اس لئے کہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ دھوپ ہمیشہ نکلا کرتی تھی۔ اور دھوپ کی عمر آفتاب کی عمر کے لگ بھاگ بتائی جاتی ہے۔ مگر دھوپ کے چشمے اب سے پہلے کبھی استعمال نہ ہوئے۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد آخر اسی نتیجہ پہ پہنچنا پڑتا ہے کہ دھوپ بھی چشمہ لگانے کا دراصل ایک بہانہ ہے۔ دھوپ نہ ہوتی تو چشمہ لگانے والے سلئے کا چشمہ ایجاد کر لیتے۔ مگر ایک بات ہے کہ چشمے کی یہ قسم ہے بہت مفید، اس سے بہت سے مقصد پورے ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک تو یہ کہ یہ چشمہ ہے۔ دوسرے یہ چھتری کا کام بھی دیتا ہے۔ پھر یہ کہ یہ ایسا چشم پوش ہے کہ آنکھ کا کوئی عیب کسی پر ظاہر نہیں ہوتا آنکھ کسی وضع کی ہو۔ بلکہ اگر نہ بھی ہو تو بھی اس چشمہ کی بدولت کسی کو پتہ نہیں چل سکتا۔ کہ واقعہ دراصل ہے کیا، لاکھوں فائدوں میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ بہت سے نظر باز محض آنکھوں کو دیکھ کر دل کا راز بھانپ لیا کرتے ہیں۔ لیکن جن کو اپنے راز عزیز ہیں وہ یہ چشمہ لگا کر اپنی آنکھوں کی غمازی کا موقع ہی نہیں دیتے کہ کوئی دوسرا دل کی بات ٹٹول سکے۔ مختصر یہ کہ یہ چشمہ صرف چشمے اور چھتری ہی کا کام نہیں دیتا بلکہ آنکھوں کیلئے خس کی ٹٹی، شملہ اور مسوری بھی ثابت ہوتا ہے پھر یہ کہ اس چشمہ سے عام چشموں کے مقابلہ میں رُعب بھی کچھ زیادہ برستا ہے۔ اور اپنے ہم چشموں میں اگر انسان کو کبھی خفت بھی اٹھانا پڑتی ہے تو چشمہ بھرم قائم رکھتا ہے اور نگہ انفعال کا پتہ نہیں چلتا۔

اس میں شک نہیں کہ چشمہ محض دل کی ایک اُمنگ ہی نہیں بلکہ آنکھوں کی طلب بھی ہے اسی زمانہ میں جبکہ صفر نمبر کے جگمگاتے اور چمچماتے حُسن افروز چشمے استعمال ہو رہے ہیں۔ موٹے موٹے نالوں کے نہایت ہیبت ناک چشمے بھی نظر آتے ہیں کہ اگر

ان کو نہ لگایا جائے تو کسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلا جائے یا لاٹھی کے سہارے راستہ طے کیا جائے مگر ایک خیال یہ بھی ہے کہ چشمے کا رواج جس قدر بڑھ رہا ہے۔ اسی قدر بینائی پنشن لیتی چلی جا رہی ہے۔ پہلے بینائی کے کمزوری کے مریض اس کثرت سے نہ تھے۔ یعنی یہ مرض موجود تو ضرور تھا مگر وبا کی شکل اختیار نہ کی تھی لیکن چشمے کا اثر رفتہ رفتہ نظروں سے ہوتا ہوا نسلوں تک جا پہنچا ہے اور اب تو پیدائشی طور پر بچے کچھ نابینا سے پیدا ہونے لگے ہیں۔ آخر ان پر کیوں نہ اثر ہو، دادا جان کا انتقال عینک لگائے لگائے ہوتا ہے۔ والدِ محترم ماں کا دودھ چھوڑنے کے بعد سے عینک لگائے ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ خاندان بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ بچپن میں تو پتہ نہیں چلتا کہ بچّہ کی نظر نزدیک کی خراب ہے یا دور کی یا دونوں۔ لڑکپن میں درد سر کی شکایت شروع ہو جاتی ہے یا سب کے چشمے دیکھ دیکھ اس کی نظر پتھرانے لگتی ہے اور وہ یہ سوچتا ہے کہ آخر وہ اس حق سے کیوں محروم ہے۔ پھر وہ ایک خوبصورت سی کمانی بازار میں دیکھتا یا دھوپ کا چشمہ خرید لیتا ہے۔ یہاں تک کہ سرکا درد یا جماعت کا بلیک بورڈ یا دھوپ کا چشمہ اس کے بھی چشمہ لگوا ہی دیتا ہے۔

ماہرینِ امراضِ چشم کا تو خیر یہ خیال نہیں ہے لیکن معترضینِ ذوقِ چشمہ کی رائے یہ ضرور ہے کہ اسی طرح رفتہ رفتہ بینائی اور پھر چند صدیوں میں آنکھ غائب ہو جائے گی۔ اور انسان کی آنکھ کی جگہ پر چشمہ ہوا کرے گا جو قدرتی طور پر عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہے گا۔ گویا عینک لباس اور زیور کی حد سے ترقی کر کے عضو بن جائے گی۔ مگر انسان کی ترقیوں سے بھی خدا بچائے۔ وہ اس وقت عینک پر لگنے والی آنکھیں ایجاد کر لے گا۔ معاف کیجیے گا یہ تو ہم وہ باتیں

بیان کرنے لگے جن کو آنکھ فی الحال نہیں دیکھ رہی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آنکھ جو
کچھ دیکھ رہی ہے اس کو بچشم خود کہیں یا بچشمۂ خود۔ دوسرا قانونی نکتہ یہ ہے کہ
آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ تو ہے چشمہ۔ اب چشمہ کیا کچھ دیکھ رہا ہے۔ یہ ہمارا
موضوع بحث نہیں۔ لہٰذا ما بخیر شما بسلامت۔ چشم ما کور چشمۂ ما روشن۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے

اُسکا لب پر آنا

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ دوسروں کو دکھانے کی کوشش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ چاہے کہ اُس کا چشمہ دوسرے کی آنکھ پر بھی لگ جائے۔ حالانکہ قدرتی طور پر یہ ناممکن ہے۔ نظر اپنی، اپنی چشمہ اپنا اپنا پھر سوال یہ ہے کہ نظر بھی اپنا اپنا کیوں نہ ہو۔ اور کیا یہ مصیبت ہے کہ آپ جو کچھ اپنی آنکھ سے دیکھیں وہی دوسروں کو بھی دکھانا چاہیں۔ صرف چاہیں نہیں بلکہ اس عجیب بات پر اس حد تک مُصر ہوں کہ کوئی اگر آپ کے نقطۂ نظر سے متفق نہ ہو تو آپ اس سے لڑ جائیں۔ دشمنی مول لے لیں اور اس کے خون کے پیاسے ہو جائیں۔ اگر غور کیجیے اور ہماری آنکھوں سے نہیں بلکہ اپنی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کیجیے۔ تو دنیا کے تمام ہنگامے خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی

سماجی ہوں یا ازدواجی، گھریلو ہوں یا بازاری۔ سب اسی زبردستی کے ماتحت ظہور میں آئے ہیں کہ دوسرے کی آنکھ پھوڑ کر اپنی آنکھ سے اس کو کچھ نہ کچھ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور یہ کبھی نہیں سمجھا گیا کہ جسطرح ہم کچھ دیکھ رہے ہیں دوسرا بھی کچھ دیکھ رہا ہوگا۔ اگر انسان فطرتاً اپنی آنکھ سے دوسروں کو سجھلانے کا شوقین نہ ہوتا اور اپنی عینک ہر آنکھ پر لگاتا نہ پھرتا تو دنیا میں کبھی کوئی ہنگامہ سر نہ اٹھا سکتا تھا مگر مصیبت تو یہ ہے کہ بغیر ان ہنگاموں کے دنیا ہی بے معنی ہو جاتی لہذا ان ہنگاموں کو ظہور میں لانے کے لئے بہت سے سامان کیئے گئے۔ مثلاً آنکھوں کے ساتھ ہی ساتھ ایک، ایک دل اور دماغ بھی ہر ایک کو دیا گیا تاکہ صرف دیکھو نہیں بلکہ سمجھو اور محسوس بھی کرو خیر یہاں تک ہی غنیمت تھا مگر ایک قباحت اور بھی ہر ایک کے حصہ میں آئی جس کو زبان کہتے ہیں تاکہ جو کچھ دیکھو جو کچھ محسوس کرو اور سمجھو وہ سب اس زبان سے کہہ بھی دو۔ اگر آنکھ دیکھتی اور زبان نہ کہہ سکتی تو بھی کوئی خطرہ نہ تھا۔ مگر لطف تو یہ ہے کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ زبان پر بھی آجاتا ہے۔ اور زبان پر اسلیئے آتا ہے کہ دوسرے کے کانوں میں ہوتا ہوا دل اور دماغ سے گزر کر آنکھوں تک پہنچ جائے اور اگر نہ پہنچے تو بس یہیں سے فوجداری شروع۔

دنیا نے ہر قسم کی ترقی کی۔ جملہ اقسام کی بیداریاں پیدا ہوئیں، طرح طرح کے انقلاب آئے۔ آزادی کا احساس اس حد تک جاگا کہ عورتوں کی آزادی مردوں کی آزادی یہاں تک کہ ادب و شاعری تک کی آزادی انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی۔ مگر نظروں کی آزادی کا کوسوں پتہ نہیں ہے۔ اور نہ اس آزادی کا کسی کو ہوش ہے۔ لیڈر اب بھی یہ چاہتا ہے کہ اس کے پیرو اس کی آنکھ سے دیکھیں۔ باپ اب بھی مُصر ہے کہ بیٹا وہی دیکھے جو والد صاحب کو نظر آرہا ہے۔ ساس اور بہو کے تمام اختلافات

کی جڑ یہ ہوا ہے کہ دونوں کا نقطہ نظر ایک نہیں ہوتا۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ ساس اور بہو دونوں میں سے ایک اندھی ہو تو شاید یہ لازمی قسم کی لڑائی ختم ہو جائے۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ وہی شادی کامیاب سمجھی جاتی ہے جس میں دلہن یا دولہا دونوں میں سے ایک نابینا ہو۔ نابینا سے مراد یہ نہیں کہ آنکھیں ہی نہ ہوں یا آنکھیں تو ہوں مگر دیکھتی نہ ہوں، جی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک اپنی آنکھوں کے جملہ حقوق سے دست بردار ہو جائے۔ مثلاً بیوی اپنی آنکھوں کے حق سے دست بردار ہو گئی اور اس نے میاں کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھنے کا کام شروع کر دیا۔ اس کا طریقہ یہ ہو گا کہ وہ اپنی آنکھوں سے صرف میاں کو دیکھے گی۔ اور میاں کی آنکھیں ساری دنیا کو گویا وہ بھی ساری دنیا کو دیکھ سکے گی مگر معرفت اپنی شوہر کے۔ شوہر کا ہر پسندیدہ منظر بیوی کا بھی پسندیدہ منظر ہو گا۔ شوہر کی ہر نگاہِ تنفر بیوی کی بھی نگاہِ تنفر ہو گی۔ گویا آنکھیں تو بظاہر چار ہوں گی مگر انہیں سے دو آنکھوں کا اور دو چشم خانوں کا کام دیں گی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ دو دل بھی ایک رہیں گے۔ اور بیوی محض آنکھوں کی نعمت سے محروم ہو کر اپنی ازدواجی زندگی کو اپنے لیے نعمت بنا لیگی یا اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہوئی یعنی شوہر صاحب نے اپنی آنکھوں کو بیوی کی آنکھوں کے لئے تج دیا تو ان کا گھر ان کی جنت ہی بن جائے گا۔ لیکن ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ میاں اور بیوی دونوں کے اتفاق سے آنکھیں ہیں اور دونوں اپنی بینائی کے حق سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہیں تو یہ سمجھ لیجیے کہ ان دونوں کی کبھی نہیں نبھ سکتی۔ شوہر اپنی آنکھ سے بیوی کو دکھائے گا کہ میرے

تمام عزیز تمہارے تمام عزیزوں سے بہتر ہیں۔ بیوی اپنی آنکھوں سے اسکے
تمام عزیزوں کے عیب دیکھ کر اپنی آنکھ سے اپنے تمام عزیزوں کے ہنر
اس کو دکھانا چاہے گی۔ وہ کہے گا کہ تم مجھ کو اندھا بتاتی ہو۔ وہ کہے گی کہ تم
مجھ کو اندھا بتاتے ہو۔ یہی تو تو میں میں یا تو طلاق کی حد پر پہنچ جائے گی ورنہ
دونوں کی زندگی تلخ بن جائے گی۔ کاش اِن دونوں میں سے کوئی اندھا ہوتا
سو باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ دوسرے کو دکھانے
کی کوشش کرتی ہے یہ تو خیر انسان کا مقدر بن چکی ہے۔ لہذا شادی کے وقت
بجائے یہ تحقیقات کرنے کے کہ لڑکا کیا لکھا پڑھا ہے۔ لڑکی کی صورت شکل
کیسی ہے۔ لڑکا کتنے سال کا ہے۔ لڑکی کے نام کچھ جائداد ہے یا نہیں۔ لڑکا کس
خاندان سے ہے۔ لڑکی سگھڑ ہے یا نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ صرف یہ دیکھنا چاہیئے
کہ لڑکا اندھا ہے یا نہیں۔ اور لڑکی میں کہیں بینائی کا مرض تو نہیں۔ اگر دونوں
میں سے ایک بھی اندھا ہو تو بس آنکھیں بند کر کے شادی کر دینا چاہیئے اور اگر
دونوں کے آنکھیں ہوں تو یہ بات گرہ میں باندھ لیجئے کہ سورج کا مغرب سے
طلوع ہونا تو ممکن ہے لیکن اِس قسم کی شادی کا خوشگوار ہونا قطعاً ناممکن ہے۔

خیر شادی بیاہ کے معاملات میں تو اس قسم کی جانچ پڑتال سے کام چل سکتا
ہے مگر اس کے علاوہ دوسرے تعلقات کو ان آنکھوں کی موجودگی میں کیونکر
خوشگوار بنایا جاسکتا ہے۔ ایک باپ کو آخر یہ کیوں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ چونکہ وہ بچے
کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا لہذا اس کا بیٹا بھی اس کو اچھی نظر سے نہ دیکھے حالانکہ
بیٹا اپنی آنکھ سے برج کو اچھی سوسائٹی فی نفسہٖ دیکھتا ہے۔ مہذب لوگوں کو

برج کھیلتا ہوا اس نے دیکھا ہے اور وہ جانتا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں اس کھیل کو اچھی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اب یا تو وہ اپنی آنکھیں پھوڑ لے یا والد صاحب کو خوش کرنے کیلئے جھوٹ بولے اور چوری چوری برج کھیلے ورنہ والد صاحب برابر یہی کہے جائیں گے کہ لڑکا نالائق نکل گیا۔ برج کھیلتا ہے یعنی قمار باز ہے۔ حالانکہ وہ غریب نہ نالائق ہے نہ قمار باز ہے بلکہ قصور اس کا صرف یہ ہے کہ اس کو بھی خدا نے اپنے باپ کی آنکھوں کے علاوہ ذاتی آنکھیں بھی دی ہیں۔ ہونا در اصل یہ چاہیئے تھا کہ باپ کی زندگی میں لڑکے نابینا ہوا کرتے اور باپ کے مرنے کے بعد تمام مال و متاع کے ساتھ ہی ساتھ آنکھیں بھی لڑکوں کو ورثہ میں ملا کرتیں یا یہ ہوتا کہ لڑکا پیدا ہونے کے بعد باپ اندھا ہو جایا کرتا مگر ان دونوں میں سے ایک بات بھی نہ ہو سکی لہذا یہ ہو رہا ہے کہ باپ چاہتا ہے کہ میری نظر سے لڑکا دنیا کو دیکھے اور لڑکا یہ سمجھتا ہے کہ والد صاحب کی نظریں تو ہیں پرانی وہ میری نظروں سے دنیا کو دیکھیں تو زیادہ اچھا ہے۔ اسی اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ لڑکے عاق ہوتے رہتے ہیں، گھروں سے نکال دیئے جاتے ہیں، باپ صورت تک دیکھنے کا روادار نہیں رہتا۔ ورنہ لڑکے نے بہت سعادتمندی سے کام لیا تو والد بزرگوار کی آنکھوں میں دھول جھونکنا شروع کر دیا اور چھپ چھپ کر وہ سب کچھ کرنے لگا جو اسکی آنکھیں اچھا دیکھتی ہیں اور اس کے والد کی آنکھیں برا۔

یہ تو خیر معمولی گھریلو باتیں ہیں۔ مگر آپ موجودہ زمانے یا کسی تاریخی زمانے کے کسی بڑے سے بڑے جھگڑے کو دیکھ لیجیئے۔ بنیاد آپ کو ہمیشہ یہ نظر آئے گی کہ اپنی آنکھوں کا منظر دوسرے کی آنکھوں میں ٹھونسنے کی کوشش کی گئی

تھی جس کا نتیجہ یہ تاریخی معرکہ ہوا۔ مذہبی لڑائیاں اسی لئے لڑی گئیں، سیاسی سر پھٹول ہمیشہ اسی کی بدولت ہوئی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہر قسم کی جنگ کی ابتدا اسی وجہ سے ہوئی کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ دوسرے کو ضرور دکھایا جائے۔ کہ یہ بھی کیا جائے کہ دوسرے کی آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ نہ دیکھے اور اس کے بجائے وہ بھی وہی نہ دیکھے جو ہماری آنکھ دیکھ رہی ہے۔ اس وقت ہمارا موضوع گفتگو بھی یہی ہے کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ ہم دوسروں کو دکھانے کی کوشش کر کے ایک نیا فتنہ بیدار کریں مگر ہم جانتے ہیں کہ ہماری آنکھ کے علاوہ دوسروں کی بھی آنکھیں ہیں اور ان سب آنکھوں کا کام بھی دیکھنا ہے۔ لہذا ہم اپنی آنکھ کو ساری دنیا کا چشمہ ثابت کرنے کی کوشش ہی کیوں کریں۔ البتہ اس موضوع کی وجہ سے یہ پورا شعر کچھ مشکوک سا ہو گیا ہے ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

ہماری رائے میں یہ شعر اصل میں یوں ہے ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ جاتا ہے سب
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

اب اس شعر کی شرح اس طرح ہو گی کہ ہماری آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ دوسروں کو دکھانے کے لئے سب کچھ لب پہ لے آتی ہے اور ہم زبردستی کوشش کرتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے دیکھا ہے وہی سب دیکھیں۔ اس سلسلہ میں ظاہر ہے کہ تو تو میں میں کے بعد ہاتھا پائی اور دھینگا مشتی تک کی نوبت آتی ہوگی لہذا یا تو اس لپاڈگی میں کسی

کی بھی آنکھ باقی نہ رہیگی اور دوسروں کی آنکھ پھوڑنے کی یہ عالمگیر کوشش عالمگیر کامیابی حاصل کرلے گی۔ ورنہ سب کے نقطہ ہائے نظر اس حد تک ایک ہو جائیں گے کہ سب کی آنکھیں مل کر ایک بہت بڑی آنکھ بن جائے گی اور یہ گول گول دنیا کا کمرہ آخر کار ایک عظیم الشان دیدہ بن کر رہ جائے گا۔ بہر حال شاعر کہتا ہے کہ محوِ حیرت ہوں کہ دنیا بالکل اندھی ہو جائے گی یا سراپا آنکھ بن کر رہے گی۔ گویا یہ طے ہے کہ یہ درمیانی صورت اور یہ دیکھنے دکھانے کی کشمکش تو یقیناً باقی نہیں رہ سکتی۔

خیر یہ تو شاعری ہے مگر واقعی غور کیجئے کہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ دوسرے کو دیکھنے پر مجبور کیوں کرتے ہیں بلکہ یہ بھی غور کیجئے کہ اس ساری پابندی کے بعد کسی قسم کی کوئی آزادی بھی صحیح معنوں میں آزادی کہی جاسکتی ہے۔ مگر نہیں ہم کو تو دراصل یہ بھی نہ کہنا چاہیئے اس لئے کہ یہ تو ہم نے بھی وہی کوشش شروع کردی جس کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ بہر حال ہم نے یہ دیکھا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ بھی یہی ضرور دیکھیں ممکن ہے اسی سلسلہ میں آپ کے پیشِ نظر کچھ اور ہی مناظر ہوں اور ہمارے اِس کہنے کے بعد آپ وہ مناظر اپنی آنکھوں سے ہم کو دکھانا چاہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بات بڑھ جائے گی اور اچھے دل بُرے ہوں گے یا تو ہم آپ کی آنکھ سے کچھ دیکھنے کو تیار ہو جائیں ورنہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ لب پہ ہی نہ لائیں اور ایک چپ سے ہزار بلائیں ٹالیں۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے

لب پر آجائے تو پھر؟

ہماری بڑی بوڑھیاں کہانی اس طرح شروع کرتی ہیں کہ۔ "آنکھوں کی دیکھی کہتے نہیں کانوں کی سنی کہتے ہیں کہ ایک تھا بادشاہ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ اُس بادشاہ کے تھے سات بیٹے" وغیرہ وغیرہ۔ گویا کانوں کی سُنی کہہ دینا اتنی ذمہ داری کی بات نہیں ہے جتنی آنکھوں کی دیکھی کہنا ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ لب پہ نہیں آسکتا۔ بلکہ اگر غور کیجئے تو عافیت بھی اسی میں ہے کہ وہ لب پہ نہ آئے۔ اس میں شک نہیں کہ کانوں کی سُنی لب پر لانا اس قدر آسان نہ ہونا چاہیئے جسقدر آنکھوں کی دیکھی کہدینا

مگر جان اسی طرح بچتی ہے کہ آنکھوں کی دیکھی پر تو مہر بہ لب رہا جائے اور کانوں کی سُنی پر زبان کے آگے خندق تک کا اختیار ہے۔ کانوں کی سُنی کہہ دینے میں ذمہ داری راوی پر جا پڑتی ہے اور آنکھوں کی دیکھی کہنے کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود راوی ہی جا پڑنے کا امکان پیدا ہو جائے۔ آنکھیں تو نہ جانے کیا کیا دیکھا کرتی ہیں۔ لیکن چونکہ دیکھتی ہیں اگر وہ سب کچھ اسی آزادی کے ساتھ کہہ بھی دیا جائے تو فوجداری ہو جائے، ہنگامہ برپا ہو جائے، مقدمے چل جائیں اور نہ جانے کیا کیا آفتیں آئیں فرض کر لیجئے کہ آنکھ ایک خاتونِ محترم کو دیکھتی ہے جو ہیں تو صنفِ نازک میں سے مگر معلوم نہیں کس چکّی کا پسا کھاتی ہیں۔ پہاڑ کی پہاڑ چلی آ رہی ہیں۔ سامنے سے ہمارے قریب آ کر نزاکت کی انتہا کے ساتھ ان کا یہ کہنا کہ "توبہ ہے میں تو تھک گئی۔ بہت دور ہے آپ کا مکان"۔ کتنا بڑا جھوٹ ہوگا۔ اب اگر اس کے جواب میں آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہی صاف صاف کہہ دیا جائے کہ "محترمہ معاف کیجئے گا یہ فاصلہ کا قصور نہیں بلکہ آپ کے موٹاپے کی خطا ہے"۔ تو ظاہر ہے کہ وہ ہزاروں باتیں سنا کر رکھ دیں گی حالانکہ ہمارا قصور صرف اسی قدر ہوگا کہ آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہی زبان سے کہہ دیا۔ مگر یاد رکھئے کہ دنیا میں اس سے بڑا قصور اور کوئی نہیں ہے کہ آنکھ کے اعتبار پر زبان ہلا دی جائے۔ ایک بدصورت کو آنکھ یقیناً بدصورت دیکھے گی مگر زبان سے اگر اس کو بدصورت کہہ دیجئے تو خود اپنی صورت کے بگڑنے کا احتمال پیدا ہو جائے۔ آنکھ بے ایمانوں کی بے ایمانی کے مناظر دیکھتی ہے مگر لبوں کو سی لینا پڑتا ہے۔ آنکھ شریفوں کی غیر شریفانہ حرکتیں دکھاتی ہے۔ مگر ہم کو

اس سلسلہ میں اپنے کو گونگا تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ظالموں کے مظالم، تمیزداروں کی بدتمیزیاں۔ باحیاؤں کی بے حیائیاں۔ ساہوکاروں کی چوریاں۔ مختصر یہ کہ آنکھ کیا کچھ نہیں دیکھتی۔ لیکن یہی وہ باتیں ہیں کہ اگر زبان پر آجائیں تو رشتہ داروں سے رشتہ داریاں، دوستوں سے دوستی، اپنوں سے یگانگت سب کچھ چھوٹ جائے۔ اور اُلٹے لینے کے دینے پڑ جائیں۔ دور کیوں جائیے سب سے زیادہ بے تکلفی، سب سے زیادہ قرب اور سب سے زیادہ اعتماد کا رشتہ میاں بیوی کا ہے۔ لیکن دنیا کا کوئی میاں اپنے میں یہ جرأت نہیں پیدا کر سکتا کہ اس کی آنکھیں بیوی کو جیسا دکھاتی ہیں ویسا ہی وہ زبان سے کہہ بھی دے بدصورت بیویوں کو حسین کہنا پڑتا ہے، بھدی شریک زندگی کو نازک اندام کہہ کہہ کر شوہر زندگی کا حق پاتے ہیں۔ فرض کر لیجئے کہ ایک بیوی واقعی حسین و جمیل ہے، کشادہ پیشانی۔ نرگسی آنکھیں، گلاب کے سے رخسار، مئے چکاں لب ہائے رنگین، خوبصورت دہانہ، مختصر یہ کہ سب کچھ ہے جس کی شوہر ہمیشہ تعریفیں کرتا چلا آیا ہے۔ مگر اس میں یہ ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی اُس بیوی سے ایک مرتبہ یہ بھی کہدے ؏

خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سُن لے

یعنی یہ کہ اور تو سب کچھ ہے مگر تمہاری ناک بہت پھیلی ہوئی ہے۔ جی نہیں۔ وہ اس بیہودہ ناک کی بھی تعریف کرنے پر مجبور ہے ورنہ ممکن ہے کہ محض اسی سچائی کی وجہ سے طلاق تک نوبت پہنچ جائے۔

اس سلسلے میں مجھے ذاتی طور پر ایک سفر میں نہایت تلخ تجربہ ہو چکا ہے

وہ تو کہیے کچھ مسافروں نے جان بچوادی ورنہ بات نہ جانے کہاں تک طول پکڑ جاتی اور کوئی تعجب نہ تھا کہ والدین کی طول عمرہ والی دعا ہی بے کار ثابت ہوتی۔ اس افسانے کو نہیں بلکہ واقعہ کو بیان کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میرے ذہن کے کسی گوشہ میں شرارت کا خیال تک نہ تھا بلکہ کچھ ایسے حالات میں سفر کر رہا تھا کہ شگفتگی میرے قریب بھی نہ آسکتی تھی۔ ایک عزیز کے انتقال کی خبر سن کر جا رہا تھا اور عزیز بھی وہ جن کے ترکہ سے مجھ کو کچھ مل بھی نہ سکتا تھا یعنی عزیزوں کے انتقال کے سلسلہ میں جو ایک خوشگوار پہلو ہوا کرتا ہے وہ بھی میری قسمت میں اسوقت نہ تھا۔ البتہ اُلٹی یہ فکر تھی کہ مرحوم اگر قرضدار جنت کو سدھارے ہیں تو یہ اور مصیبت ہوگی اور کہیں ایسی صورت نہ پیدا ہو جائے کہ ان کے یتیم بچوں کو اب تک کوئی سرپرست نہ ملا ہو اور وہ اس خاکسار پر حملہ کر بیٹھیں کہ والد مرحوم کے بعد اب جو کچھ ہیں آپ ہی ہیں۔ مختصر یہ کہ ان افکار میں اُلجھے ہوئے سفر کر رہے ہیں کہ ایک اسٹیشن پر ایک صاحب لمبے، تڑنگے، ڈاڑھی چڑھائے، خضاب لگائے راجپوتی شان کی پگڑی باندھے اپنے قد سے کچھ اونچا اور ہماری کلائی سے موٹا لٹھ لئے ہمارے درجہ پر حملہ آور ہوئے، ٹوکرے، ٹوکریاں، صندوق، صندوقچیاں گٹھریاں، یہاں تک کہ ایک طوطے کا پنجرا بھی سب اسی درجہ میں اُچھالنے کے بعد دو خواتین کے ہمراہ تشریف لے آئے۔ اور ایک سیٹ پر جو ہماری سیٹ کے مقابل تھی بیٹھ گئے اور ٹرین روانہ ہو گئی۔ اب ذرا ان کے متعلق یہ بھی سن لیجیے کہ انکی عمر کسی طرح پچاس سے کم نہ ہو گی جس کا اندازہ ان سفید بالوں سے ہو رہا تھا جو خضاب کی اوٹ سے جھانک رہے تھے۔

ان بزرگ محترم کے ساتھ جو دو خواتین تھیں وہ ہر چند کہ پردہ دار تھیں یعنی اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی۔ مگر سفر میں اپنے درجے والوں سے کون پردہ کرتا ہے لہذا تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں بے پردہ ہو گئیں۔ اب ان کے سن و سال کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ ہے تو یہ ذرا بدتمیزی کی بات مگر کیا کیا جائے ؎

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات

اگر یہی بات نہ بتائی گئی تو یہ واقعہ بیان نہ ہو سکے گا ان میں سے ایک تو بے چاری لڑکی ہی تھی۔ یہی کوئی بارہ سال کی ہوگی ہیں۔ دھان پان سی لڑکی۔ دوسری کوئی تیس بتیس برس کی تھیں۔ یہ حضرت بظاہر ان دونوں سے بیزار انکی طرف پیٹھ کئے ہوئے اپنی جنگجویانہ شان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ناگاہ اس لڑکی نے کچھ کہا مگر آپ متوجہ نہ ہوئے۔ اس غریب نے پھر ہاتھ ہلاکر اور چوڑیاں بجا کر آپ کو متوجہ کرنا چاہا مگر آپ کو اطلاع نہ ہو سکی تیسری مرتبہ بھی جب آپ کے کان پر جوں نہ رینگی تو شامتِ اعمال ہم نے نہایت سادگی سے کہدیا "دیکھئے آپ کی صاحبزادی کچھ کہہ رہی ہیں۔ بس صاحب یہ کہنا تھا کہ معلوم ہوا بارود کے قلعہ میں کسی نے آگ لگادی۔ بھڑک ہی تو اٹھے ایکدم سے یہ بزرگ۔ "آپ بے وقوف بناتے ہیں۔ مذاق کرتے ہیں۔ شرم نہیں آتی۔ صورت سے تو بڑے شریف زادے نظر آتے ہو" اور بہت سی ایسی باتیں کہہ گئے جن کا براڈ کاسٹ کرنا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ مختصر یہ کہ وہ برس رہے تھے اور ہم حیران تھے۔ آخر بڑی دیر تک سخت سست کہنے کے بعد فرمایا۔

"دکھائی نہیں دیتا تم کو کہ یہ صاحبزادی ہیں میری یا بیوی" ہم نے نہایت ادب سے کہا "جناب والا پہلے سمجھ لیجئے غصہ بعد میں کیجئے گا۔ آپ کی صاحبزادی ہی کچھ کہہ رہی

ہیں، بیوی تو چپکی بیٹھی ہیں:۔ اب جناب وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ ایکدم اچھل کر کھڑے ہی تو ہو گئے اور ایک دوسرے مسافر سے کہنے لگے :: دیکھئے ان صاحبزادے کو منع کر دیجئے ورنہ میں نہیں جانتا کہ اسوقت کیا ہو گا بیوی کو بیٹی اور ساس کو بیوی بنائے چلے جا رہے ہیں:: اب ہماری سمجھ میں آیا کہ قصہ اصل میں ہے کیا دوسرے مسافروں نے ان حضرت کو کسی نہ کسی طرح ٹھنڈا کیا اور ہم لوگ اٹھا کر ایک دور کی سیٹ پر لے گئے مطلب یہ کہ بڑی مشکل سے یہ ہنگامہ ختم ہو سکا۔

اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد صرف اسی قدر تھا کہ آنکھ جو کچھ دیکھے اس کو زبان پر لانا کسی وقت بھی خطرے سے خالی نہیں ہے آنکھ نے ہم کو یہ دکھایا کہ یہ لڑکی ان صاحب کی بیٹی ہے حالانکہ تھی وہ بیوی۔ اسمیں ہر چند کہ ہماری کوئی خطا نہیں تھی جو دیکھتا یہی سمجھتا۔ قصور اگر تھا تو ان ہی صاحب کا تھا کہ ایسی بے جوڑ شادی کی تھی اور بیوی کے چہرے پر اس مضمون کی تختی بھی نہ ٹانگی تھی کہ اس کو میری بیٹی نہیں بیوی سمجھو۔ مگر اسوقت گنہگار بن کر ہم رہ گئے اور بعد میں بھی سخت افسوس رہا کہ ہم نے آنکھوں کا اعتبار ہی کیوں کیا لیکن اس درس عبرت کے بعد سے اپنا طریقہ یہ ہو گیا کہ دیکھتے سب کچھ ہیں اور نہ جانے کیا کیا دیکھتے ہیں مگر ان باتوں کو کہنے کی باتیں کبھی نہیں سمجھتے۔ گویا اب ہوتا یہ ہے کہ جو دیکھتے ہیں وہ کہتے نہیں اور جب کہتے ہیں اسے دیکھنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے اور زبان اور آنکھ کے درمیان اب کوئی ربط نہیں رہا ہے۔ اُس کا میدان الگ اِسکا عالم جدا۔ اس طریقۂ کار سے ایک فائدہ یہ ۔۔۔۔۔ تو ضرور پہنچ رہا ہے کہ ہم کو اندھا بننے اور گونگا بننے دونوں کمالات میں مہارت حاصل ہو چکی ہے یعنی جسوقت ہم اندھے نہیں ہوتے گونگے ضرور ہوتے ہیں اور جسوقت گونگے نہیں ہوتے اسوقت ہماری آنکھیں ع

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

سوسائیٹی چور کو بخش دیتی ہے۔ بے ایمان کو معاف کر دیتی ہے حد یہ ہے کہ خونی تک کو ممکن ہے کہ گردن زدنی نہ سمجھے لیکن نہیں معاف کرتی تو سچ بولنے والے کو۔ ایک سچ بولنے والا مشکل ہی سے کامیاب ہو سکتا ہے مشکل ہی سے ہر دلعزیز ہو سکتا ہے اور مشکل ہی اُبھر سکتا ہے۔ سچ بولا جاتا ہے آنکھ اور زبان کے تعاون سے اور سچ پوچھئے تو یہی خطرناک بات ہے۔ مثلاً آپ ہی بتائیے کہ وہ شخص کیونکر ترقی کر سکتا ہے کہ جو کسی نہایت ہی بدصورت رئیس کے یہاں ملازم ہے۔ وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ یہ بدہیئت رئیس نہایت قیمتی پوشاک میں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا، "خط زشت است کہ بہ آب زر نوشتہ" وہ اگر ایمانداری سے کام لے کر یہی بات آقائے نامدار سے کہدے تو اسی وقت نکال باہر کیا جائے یا اگر مصلحت اور صلح جوئی کی بنا پر خاموش رہ جائے تو بھی اس کے لئے کوئی ترقی کا امکان نہیں۔ البتہ اگر وہ اپنی آنکھوں سے بغاوت کر کے اس قسم کی باتیں کہدے کہ "حضور میری آنکھوں میں خاک جامہ زیبی تو ختم ہے سرکار پر۔ لوگ لباس سے اپنی زیبائش بڑھاتے ہیں اور حضور کے جسم پر لباس آ کر حسین معلوم ہونے لگتا ہے" تو البتہ اسکی کامیابی بھی یقینی ہے اور ترقی بھی برحق۔ ایک ماتحت اگر اپنے افسر کی نالائقی دیکھ اس کو نالائق کہدے تو نتیجہ معلوم۔ ایک خورد اپنے بزرگ کی بے ایمانی دیکھتا ہے مگر سعادتمندی اسی میں ہے کہ وہ چپ رہے۔ ورنہ سچ بول کر وہ نالائق بھی سمجھا جائے گا اور ممکن ہے کہ جائداد سے بھی محروم کر دیا جائے ایک دوست اسی وقت تک دوست رہ سکتا ہے جبتک کہ وہ اپنے دوست کی کمزوریاں دیکھے اور ان کو اپنی زبان پر نہ لائے ورنہ اس سے بڑا دشمن، اس سے بڑا غدار

اور اس سے زیادہ قابل نفرت اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اچھا باپ وہی سمجھا جاتا ہے
جس کو بیٹے کی برائیاں اچھائیاں نظر آئیں جیسی بیوی وہی ہو سکتی ہے جو شوہر کی خامیوں
کی طرف سے آنکھیں بند کر کے ہر وقت اس کی شان میں تو تصنیف قصیدہ پڑھا کرے
بہترین شوہر وہی ہے جو اپنی بیوی کی کوئی خرابی نہ دیکھ سکے یا اگر دیکھ سکتا ہو تو کہہ
نہ سکتا ہو۔

مختصر یہ کہ آنکھ منجملہ دوسرے مناظر کے ایک عجیب منظر یہ بھی دیکھ رہی ہے کہ جو
دیکھا جاتا ہے وہ بیان نہیں ہو سکتا اور جو بیان ہوتا ہے وہ یقیناً دیکھا نہیں جاتا
ورنہ ظاہر ہے کہ بیان ہی نہ ہو سکتا۔ کسی زمانہ میں ایک چیز پائی جاتی تھی جس کا نام
تھا اخلاقی جرأت۔ یہ چیز شروع شروع میں تو بڑے کام کی اور نہایت قیمتی ثابت
ہوئی لیکن دنیا نے جتنی جتنی ترقی کی رفتہ رفتہ اس چیز کا پول کھل گیا اور تجربہ سے ثابت
ہوا کہ یہ چیز بڑی دشمنِ انسانیت، نہایت خطرناک اور حد درجہ مُفسد ہے۔ اس کی
بدولت اچھے دل بُرے ہوتے ہیں۔ لڑائیاں ہوتی ہیں۔ سر پھٹول اور خون خرابے
تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ اس کو متروکات میں رکھ دیا گیا اور کہا یہ گیا کہ جرأت
و اخلاق کا کوئی سمبندھ نہیں یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اخلاق اگر ہے تو جرأت
پیدا ہی نہیں ہو سکتی اور جب تک جرأت سلامت ہے اس وقت تک اخلاق کا ظہور میں آنا نا ممکن
ہے۔ لہٰذا جرأت کو تو مقابلے کے خاص خاص میدانوں کی طرف روانہ کیا گیا اور اخلاق
کو سوسائٹی کے لئے رکھ لیا چنانچہ اس تقسیم کے بعد ہماری اصطلاحات بدلیں۔
اعتبارات میں انقلاب آیا اور حالات کچھ کے کچھ ہو گئے۔ اب اخلاق کا تقاضہ یہ
ہے کہ جو کچھ آنکھ دیکھے اس کو از راہِ مروّت، رواداری کے طور صلح و صفائی کے لئے

امن کی خاطر زبان پر نہ لایا جائے اور اگر لایا جائے تو عیب جوئی کے طور پر نہیں بلکہ فخر کے طور پر۔ گویا اب مروّت اسی کا نام ہے کہ آنکھ سے دیکھیں کچھ اور زبان سے کہیں کچھ۔ رواداری کی جدید تعریف یہ ہے کہ آنکھ دیکھے "آہ" اور زبان کہے "واہ" امن اسی طرح قائم رہ سکتا ہے کہ دیکھو اپنی آنکھ سے اور کہو زمانے کی زبان سے تو گویا آنکھ نے اس طرح یہ رنگ دیکھا کہ دنیا اب سچائی کو برداشت کرنے کے لئے قطعاً تیار نہیں ہے۔ پہلے نکتہ چینیوں کی نکتہ چینیاں دوا کے طور پر صحت کے لئے برداشت کر لی جاتی تھیں مگر اب یہ دوا زہر سمجھی جاتی ہے اور زہر دینے والے کی جو سزا ہے وہی نکتہ چینی کے لیے مقرر کی گئی ہے پہلے تو لوگ یہاں تک کرتے تھے کہ اپنی آنکھ کا شہتیر دیکھنے کے بجائے دوسروں کی آنکھ کا تنکا دیکھ لیا کرتے تھے مگر اب خود اپنی آنکھ کا تنکا نکال لینے کے بعد بھی ان کو اس کا کوئی حق نہیں کہ دوسروں کی آنکھ کا شہتیر دیکھیں، اس رواداری مروت اور اخلاق کا نتیجہ یہ ہے کہ جس کا جدھر مُنہ اُٹھ جاتا ہے اسی طرف اس کے لئے ایک نئی راہ نکل آتی ہے اعتراض کرنے والوں کی زبانوں پر اخلاق کا پہرہ پہلے ہی بٹھا دیا گیا ہے۔ اور اگر پھر بھی وہ بد اخلاقی سے کام لیکر اعتراض کریں تو انکو جواب دینے کے لئے جرأت سے کام لینا پڑتا ہے۔ یعنی اخلاق کا مقابلہ اگر جرأت سے کر دیا جائے تو اخلاق بیچارہ اخلاقاً خاموش ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس نئی دنیا کا رنگ بڑے بوڑھے دیکھ رہے ہیں مگر دم نہیں مار سکتے اسلئے کہ کچھ بولے اور خبطی سمجھے گئے یا اگر وہ بول دیتے ہیں تو ان کو سمجھا دیا جاتا ہے کہ آپ پرانے لوگ ہیں اور یہ نئی دنیا ہے لہذا اسی کو غنیمت جانیئے کہ آپ سے جگہ خالی کرنے کا مطالبہ ابتک نہیں ہوا ہے۔ آپ نے اور آپ کے زمانے نے بہت سی حقیقتوں پر موٹے موٹے پردے

ڈال رکھے ہیں۔ آپ نے سچ بولنے کی جرآت نہ کی۔ سچائیوں کو چھپاتے تھے اور تصنع کو بے نقاب کر رکھا تھا۔ اب تصنع پردے میں بیٹھے گا اور حقیقتیں پردے سے باہر آئیں گی۔ بڑے بوڑھے اس کو بداخلاقی سمجھتے ہیں اور نئی دنیا اس کو عین اخلاق۔ ادھیڑ عمر والے یعنی ہم لوگ حیرت سے یہ کشمکش دیکھ رہے ہیں مگر آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اسکو زبان پر اس لئے نہیں لاسکتے کہ معلوم نہیں جیت کس کی رہے بہت سے مناظر جنکو آنکھ برا سمجھ رہی ہے ممکن ہے کہ اچھے مان لئے جائیں اور بہت سے تماشے جن کو آنکھ اچھا سمجھ کر دیکھ رہی ہے ممکن ہے کہ بیان کے قابل ہی نہ سمجھے جائیں۔ لہذا فی الحال مفر اسی منافقت میں ہے کہ دیکھنے میں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ سمجھنے کا بھی اختیار حاصل ہے مگر بیان کرنے اور دوسروں کو سمجھانے کا وقت یہ نہیں ہے۔ ایک چپ ہزار بلائیں ٹالتی ہے بشرطیکہ اس ایک بلا پر انسان حاوی ہوسکے ::

ختم شد

شائستہ

اس لڑکی کا کردار ایک صد پہلو آئینہ ہے

جس میں دیکھنے والے کو اپنی سبھی شکلیں نظر آئیں گی۔ محبت، ہوس، لگاؤ

لاگ، نفرت، پندار ـــــ اس آئینہ میں کون سا روپ نہیں،

عورت لکھتے وقت جگ بیتی کو آپ بیتی۔ اور آپ بیتی کو جگ بیتی ہے

بنا دیتی ہے۔

نادرہ خاتون ـــــ نے اس ناول میں جو نقاب اٹھائے ہیں

وہ نہ جانے "شائستہ" کی روح کے ہیں، یا اس کی اپنی روح

کے، یا ہماری آپ کی روح کے۔

خون ہی خون

- پردیپ کی منگیتر اس کی بیوی روپا کو پراسرار طور پر قتل کردیا گیا۔
- پردیپ کی ماں نے جائے واردات سے ایک خونخوار چاقو اس لئے چھپا لیا کہ پردیپ کی جان بچائے۔
- پردیپ کی بہن نے چاقو کو ٹھکانے لگانے میں مدد کی۔
- پردیپ، اس کی ماں اور اس کی بہن تینوں کو قتل کے الزام میں دھر لیا گیا۔

شہزادہ تبسم بی۔اے ——— کا ——— بہترین خونی ناول

"خون ہی خون" پڑھئے

قیمت صرف - - - - - - - چار روپے ۸ آنے

خون کا دریا

ایک حسین وجمیل لیڈی ڈاکٹر کی سنسنی خیز داستان

جسے پولیس نے کہا۔

"ہمارے خیال میں تم قاتل ہو۔ اگر اس سے انکار کرتی ہو تو ڈھائی گھنٹے کے اندر اصلی قاتل کو گرفتار کرکے ہمارے سامنے پیش کرو۔"

خون کا دریا ——— شہزادہ تبسم کا عظیم ترین کارنامہ ہے

کاغذ سفید گلیز، خوشنا حسین ٹائیٹل، بہترین صاف ستھری کتابت طباعت قیمت تین روپے چار آنے

پتہ:- نیو تاج آفس پوسٹ بکس نمبر ۱۶۲۹ دہلی